بہتے لہو کی کہانی
ہیرک لودھی

بہتے لہو کی کہانی

ببرک لودھی

انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز پشاور

(جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں)

ناشر ـــــ انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز پشاور

مطبع ـــــ اللہ والا پرنٹرز ۱۸ شاہراہِ قائداعظم لاہور

بار اوّل ـــــ جولائی ۱۹۸۲ء

تعداد ـــــ دو ہزار

قیمت ـــــ ۲۶ روپے

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
	باب ۱ سُرخ آندھی سے پہلے	۱۷
	امیر امان اللہ خان	۱۸
	نادر شاہ	۲۰
	ظاہر شاہ	۲۰
	داؤد کی برطرفی	۲۱
	داؤد کی دوبارہ آمد	۲۲
	کمیونسٹ پارٹی	۲۷
	نور محمد ترہ کی	۳۰
	حفیظ اللہ امین	۳۱
	ببرک کارمل	۳۱
	باب ۲ خونیں شام	۳۳
	پُرانے زخم ہرے ہو گئے	۳۴
	زرعی اصلاحات	۳۷

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۳۸	امریکی سفیر کا قتل	
۳۹	شیعہ کُشی	
۴۰	فوجی بغاوت	
۴۱	ترہ کی کا انجام	
۴۳	امین کا دَور	
۴۵	رُوسی سفیر کی تبدیلی	
۴۵	درخت کاٹنے کی مہم	
۴۶	قیمتی نوادرات کی لُوٹ مار	
۴۶	امین کا عبرتناک انجام	
۴۹	**تاریک رات**	**باب ۳**
۵۱	کارمل کا تاریک دَور	
۵۲	تعلیمی اداروں میں بے چینی	
۵۳	اوچھے ہتھکنڈے	
۵۵	زرخرید مولوی کانفرنس	
۵۶	بپھرا ہُوا طُوفان	
۵۹	انتظامی بُحران	
۶۱	کلیدی آسامیوں پر رُوسیوں کا تقرر	
۶۲	رُوسی فوج کی واپسی کا ڈرامہ	

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۶۳	ناموس کے لٹیرے	
۶۴	افغانستان ویت نام نہیں	
۶۷	**باب ۴ اشتراکی بربریت**	
	ایک صحافی کا لرزہ خیز قتل	
۷۲	پل چرخی کے قیدیوں پر کیا گزری ؟	
۷۵	ترہ کی کے خاندان پر کیا بیتی ؟	
۷۶	ایک بڑھئی کی کہانی	
۷۸	اشتراکی انصاف کے نمونے	
۸۱	گورنروں کے مظالم	
۸۳	رُوسیوں کی دہشت گردی	
۸۴	جمہوریت مارکیٹ میں لوٹ مار	
۸۷	**باب ۵ کمیونزم نے کیا دیا !**	
۸۷	حساب چکا دیا	
۸۸	فریاد کا جواب	
۸۸	بدتمیز حکمران	
۸۹	معزز شخص	
۹۰	بچہ سقہ کا دور	

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۹۱	اقربا پروری	
۹۲	وطن فروش غنڈے	
۹۴	جھوٹ کا سیلاب	
۹۶	مغربی ذرائع ابلاغ	
۹۷	پشتونوں کے دوست	
۱۰۰	چرسی فوج	
۱۰۰	واخان پر روسی قبضہ	
۱۰۳	**چشم دید**	**باب ۶**
۱۰۷	باپ نے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ختم کیا	
۱۱۱	پغمان کے مجاہدین	
۱۱۵	**تحریکِ اسلامی**	**باب ۷**
۱۱۵	اذان کس نے دی !	
۱۱۶	آزمائش کی بھٹی	
۱۱۷	الجہاد الجہاد	
۱۱۸	مجاہدین کی کامرانیاں	
۱۲۱	اتحاد ناگزیر ہے	

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
باب ۸	**افغانستان کے ہمسائے**	۱۲۳
	پاکستان کا مثالی کردار	۱۲۳
	قابلِ تعریف تحمل	۱۲۴
	فراہمی اسلحہ کا الزام	۱۲۵
	چالیس لاکھ مہاجرین	۱۲۶
	پاکستان کی تحریکِ اسلامی	
	ایران	۱۲۹
	بھارت	۱۳۰
	عوامی جمہوریہ چین	۱۳۲
باب ۹	**اقوامِ عالم اور عالمِ اسلام کا ردِّ عمل**	۱۳۵
	روس کو دعوت کس نے دی!	۱۳۶
	بھارت - پہلے حمایت پھر مخالفت	۱۳۷
	جنرل اسمبلی کی قرارداد	۱۳۸
	اسلامی وزرائے خارجہ کا دوسرا اجلاس	۱۴۰
	ماسکو اولمپکس کی ناکامی	۱۴۰
	سخاروف کا کلمۂ حق	۱۴۱
	مغربی ممالک کا ردِّ عمل	۱۴۱
	جنرل اسمبلی کی دوسری قرارداد	۱۴۳

نمبر شمار	مضامین	صفحہ
	دُنیا کے ضمیر کا سوال	۱۴۴
	عالمِ اسلام کا ردِّ عمل	۱۴۵
بابﷲ	اِستعماری طاقتیں اور افغانستان	۱۴۹
	رُوس	۱۴۹
	دماغوں پر قبضہ	۱۵۰
	پرایا مال اپنا	۱۵۰
	ملکوں کی تجارت	۱۵۱
	زہریلا لٹریچر	۱۵۲
	بیمار ماحول	۱۵۲
	بغاوت کا ڈھونگ	۱۵۳
	متوازی پراپیگنڈا	۱۵۴
	کمیونسٹوں کی جنّت	۱۵۵
	بے ضمیر وظیفہ خوار	۱۵۶
	طوطا چشمی	۱۵۷
	عرب دوستی کا ڈھونگ	۱۵۷
	افغانستان کو کیا دیا !	۱۵۹
	فوجی امداد	۱۶۰
	اسیرانِ بلاصالک	۱۶۱

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۱۶۱	رُوس کے دوست ممالک	
۱۶۲	امریکہ	
۱۶۴	ہمدردی کی حقیقت	
۱۶۵	مفادات کی جنگ	
۱۶۶	مہاجرین کی امداد	
۱۶۷	مشروط حمایت	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

افغانستان کی سرزمین اپنے جغرافیائی محلِ وقوع کی وجہ سے صدیوں سے تاریخی اہمیت کی حامل چلی آرہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا کی اکثر بڑی طاقتوں نے ہمیشہ اس مُلک کو للچائی ہُوئی نظروں سے دیکھا ہے اور ایشیا کے اس خطّے کے ممالک پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لیے افغانستان کو اپنی منزل کی جانب پہلے زینے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان ممالک میں سرِفہرست رُوس ہے، جس کو خلیج کے گرم پانیوں تک پہنچنے کی وصیّت ورثے میں ملی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیٹر کے بعد ہر دور کے رُوسی حکمرانوں کو خلیج تک پہنچنے کا خواب ستاتا رہا ہے جسے ایک زندہ حقیقت بنانے کے لیے وہ مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے چلے آئے ہیں۔ اس منصوبے کے ابتدائی مراحل کے طور پر رُوس نے قفقاز اور وسطِ ایشیا کی مسلمان ریاستوں کو ہوسِ مُلک گیری کا نشانہ بنایا، پھر اگلے مرحلے میں افغانستان کو اپنا ہدف ٹھہرایا۔ افغانستان کے عوام کو قفقاز اور وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کے سے حشر سے دوچار کرنے کے لیے رُوس

نے مکر و فریب کی پالیسی اپنائی اور افغانوں کے خیر خواہ کے رُوپ میں افغانستان میں داخل ہُوا۔ رُوس نے افغانستان کی پسماندگی اور مجبُوری سے بھرپُور فائدہ اُٹھایا اور اقتصادی ترقّی کا چکمہ دے کر اُس کی آزادی کے درپے ہوگیا۔ اس نے مالی اور فنّی امداد کے عوض افغانستان کے ناعاقبت اندیش حکمرانوں سے من مانی مراعات حاصل کرلیں اور افغان فوج اور عوام میں مفاد پرست اور بددین اور وطن فروش عناصر کو کمیونزم کا سبز باغ دکھا کر اُنہیں اپنے ہی وطن کے خلاف سازشوں پر اُکسایا۔

افغانستان میں رُوس کی یہ حکمتِ عملی نہایت کامیاب رہی۔ ایک طرف اُس نے افغانوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا شروع کیا، دُوسری طرف افغان حکومتوں کے ساتھ مختلف اقتصادی معاہدوں کی آڑ میں اپنے سیاسی کارکن اور فوجی مشیر مختلف ناموں سے افغانستان میں بھیجے جو اپنے مُلک کے خُفیہ مگر دُور رس منصوبے نہایت اطمینان سے مکمل کرنے لگے، رُوس کے لیے یہ چیز سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوئی۔ افغانستان میں زیرک اور دُور اندیش قیادت کا فقدان تھا۔ رُوسی کمیونسٹوں نے افغان حکمرانوں کی غفلت سے خُوب فائدہ اُٹھایا اور اس ملک میں ایک طویل عرصے تک رہ کر رُوس کی براہِ راست مداخلت کی راہ ہموار کرلی۔ اس سلسلے میں ظاہر شاہ اور داؤد کا کردار نہایت شرمناک ہے۔ اُنہوں نے افغانستان میں رُوس کی سرگرمیوں کا کوئی نوٹس نہیں لیا، اور اپنے ملک کو اُس کے نرغے سے نکالنے کے لیے کسی قسم کا دُور اندیشانہ قدم نہیں اُٹھایا۔

اس سازگار فضا میں رُوس نے افغانستان کی نوجوان نسل کو پُوری طرح گرفت میں لے لیا۔ اب افغان حکومت کی مشینری رُوسی ایجنٹوں اور رُوسی مشیروں کے رحم وکرم پر تھی۔ خود داؤد اور ظاہر شاہ کی گرفت اپنی حکومت کی باگ ڈور پر نہ رہی۔ یہ صُورتِ حال دیکھ کر اُن کے بھی اَوسان خطا ہوگئے؛ چنانچہ اپنے آپ کو بچانے کے لیے وہ رُوس کی دوستی کا ہار اپنے گلے سے اتارنے کی فکر کرنے لگے، لیکن جونہی انہوں نے اس ہار کو نوچنے کے

لیے ہاتھ بڑھائے، وہ پھانسی کے پھندے میں تبدیل ہوگیا جس میں یکے بعد دیگرے، ان دونوں کا دم گھٹ کر رہ گیا۔ ان کو منظر سے ہٹانے کے بعد رُوس کا ایک ایجنٹ نور محمّد ترہ کی اپنے سُرخ آقاؤں کی مدد سے کُرسیٔ صدارت تک پہنچ گیا۔ برسرِ اقتدار آتے ہی اُس نے اپنے محسنوں کو خوش کرنے کی خاطر افغان عوام کے اسلامی اور ملّی تشخّص کو پامال کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد شروع کیا اور افغانستان میں کُشت و خُون کا بازار گرم کر دیا۔ افغان عوام کو جب ترہ کی اور اُس کے حواریوں کے عزائم کا علم ہُوا، تو اُنہوں نے ملحدوں کے اس گروہ کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ ترہ کی بہت جلد اپنوں کی رقابت کی بھینٹ چڑھ گیا اور حفیظ اللہ امین نے اُس کی جگہ لے لی۔ اُس نے بھی اپنے پیشرو کی پالیسی اپنائی، لیکن مقدُور بھر کوشش کے باوجود کرِیملن کے آقاؤں کو خوش نہ کر سکا۔ رُوس کو افغان مجاہدین کی بڑھتی ہُوئی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنی ساری محنت اکارت جاتی نظر آنے لگی، چنانچہ اُس نے امین کو بھی ایک بھیانک موت کے تاریک غار میں دھکیل دیا اور اُسے اپنے منطقی انجام تک پہنچایا۔ اب کی بار رُوس اپنے کسی افغان ایجنٹ پر انحصار نہیں کرنا چاہتا تھا؛ چنانچہ حفیظ اللہ امین کے خاتمے کے ساتھ ہی اُس نے جدید ترین اسلحے سے مسلّح اپنی ایک لاکھ فوج افغانستان میں جھونک دی اور دُنیا کی آنکھ میں دُھول جھونکنے کی خاطر اپنے ایک تیسرے ایجنٹ ببرک کارمل کو اقتدار کی کُرسی پر باہر سے لا بٹھایا۔ افغانستان میں رُوسی جارحیت کے بعد وہاں کے غیّور عوام کی سرگرمیاں مزید شدّت اختیار کر گئیں۔ افغانستان کا بچّہ بچّہ سر پہ کفن باندھے، شوقِ شہادت سے سرشار، اپنے دین و وطن کے دشمن کے خلاف نبرد آزما ہُوا۔

افغانستان میں حق و باطل کی یہ کشمکش چار سال سے زیادہ عرصے سے جاری ہے۔ ابھی تک لاکھوں افغان سُرخ عفریت کا شکار ہو چکے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ تعداد اشتراکی بربرّیت کی وجہ سے اپنے وطن کو الوداع کہہ چکی ہے۔

ملّتِ اسلامیہ کے اس تازہ المیئے پر مشرق و مغرب میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی

ہیں اور مختلف نقطہ ہائے نظر سے افغانستان میں رُونما ہونے والے حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کتابوں کی وجہ سے دُنیا کے مختلف خطّوں میں بسنے والے لوگ کسی حد تک افغانستان کے بُحران سے آگاہ ہوچکے ہیں، لیکن اُن کے ذہنوں میں ابھی تک اس عظیم المیّے کی صحیح تصویر نہیں اُبھری۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں افغانستان سے بہت دُور بیٹھ کر لکھی گئیں اور ان کے مصنّف کسی طرح بھی صُورتِ حال کا صحیح تجزیہ پیش نہیں کرسکے۔ ان حالات میں ایک کُہنہ مشق افغان صحافی کی اس موضوع پر تصنیف نعمتِ غیر مُترقبہ سے کم نہیں۔

ببرک لودھی نے افغانستان کی سرزمین پر آنکھ کھولی ہے، وہ افغانستان میں اشتراکیت کے مختلف رُوپوں کے چشم دید گواہ ہیں اور افغانستان میں رُونما ہونے والے حالات کے تاریخی عوامل سے بخوبی آگاہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُنہوں نے اپنے فرض سے نہایت دیانتدارانہ طریقے سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہے۔

ببرک لودھی جنوری ۱۹۴۷ء میں کابل کے ایک متوسّط گھرانے میں پیدا ہُوئے۔ ابتدائی تعلیم کابل کے شاہِ دوشمشیرہ سکول میں حاصل کی۔ بعدازاں اُنہوں نے حصولِ علم کی خاطر پاکستان کا رُخ کیا۔ ۱۹۶۵ء میں وطن واپسی پر کچھ عرصے تک پبلک لائبریری کابل سے وابستہ رہے۔ موصوف ۱۹۷۱ء میں روزنامہ کابل ٹائمز کے ساتھ ایک نامہ نگار کی حیثیّت سے منسلک ہوگئے۔ بعد میں اسی اخبار کے مینجنگ ایڈیٹر مقرر ہُوئے۔ کچھ عرصے تک کابل میں اقوامِ مُتّحدہ کے ترقیاتی شُعبے کی طرف سے (U.N. AFGHAN FOCUS) کے نام سے ایک سہ ماہی مجلّہ شائع کرتے رہے۔

ببرک لودھی افغانستان کے ایک مایۂ ناز صحافی ہیں، اُن کے نام سے افغانستان کے لوگ بخوبی آگاہ ہیں۔ اسی حیثیّت سے اُنہوں نے اپنا قلم افغانوں کی فلاح و بہبُود کے لیے وقف کیا تھا، لیکن رُوسی جارحیّت کے بعد جب اُن کے لیے افغانستان کے حالات نامساعد ہوگئے اور وہ اپنے قلم کو اپنی مرضی کے مطابق حرکت میں نہ لا سکے، تو اُنہوں نے

ملک سے باہر جا کر دشمن کے خلاف قلمی محاذ پر جنگ جاری رکھنے کا عزم کیا۔ موصوف کی زیرِ نظر کاوش اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔

ببرک لودھی نے ایک صحافی کی حیثیت سے افغانستان میں جنم لینے والے واقعات و حوادث کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے اس المیئے کا تذکرہ نہایت وضاحت سے کیا ہے۔

زیرِ نظر تصنیف تاریخ کی کتاب نہیں، بلکہ افغانستان کے متعلق اُن کے احساسات، جذبات اور تجزیے کا نچوڑ ہے جس میں قاری کو نہایت مؤثر پیرائے میں افغانستان میں کروٹ لینے والے واقعات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

نامور افغان صحافی نے دس ابواب پر مشتمل اس کتاب میں افغانستان کے بحران کا مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ اس کتاب میں آپ کو جہاں رُوسی جارحیت سے پہلے افغان حکمرانوں کے ناعاقبت اندیشی اور مصلحت کوشی کا ذکر ملے گا، وہاں جارحیت کے بعد رُوسی ایجنٹوں کی مجرمانہ اور ظالمانہ ذہنیت کی تصویر بھی دکھائی دے گی۔ موصوف نے اگر ایک طرف افغانستان کے معاملے میں غیروں کی سرد مہری پر برہمی کا اظہار کیا ہے تو دوسری طرف اُنہوں نے اپنوں کو بھی اُن کے جُرمِ مصلحت کوشی پر معاف نہیں کیا۔

کتاب میں ایک سُپر طاقت کے خلاف افغان مجاہدین کے کردار کی تصویر کشی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے، جس کو پڑھ کر انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے کہ افغان عوام کی یہ سرگزشت محض آہوں اور سسکیوں کا نوحہ نہیں ہے، بلکہ ایثار، جُرأت اور انسانی عظمت کی ایسی کہانی ہے جس کی مثالیں تاریخِ عالم میں خال خال ہی ملیں گی۔

ببرک لودھی نے افغانستان کے موجُودہ المیئے کو حقیقی صُورت میں دُنیا کے سامنے پیش کرنے کی ایک اچھی کوشش کی ہے۔ اِس کتاب کی اشاعت سے انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل سٹڈیز کا مقصد بھی یہی ہے کہ دُنیا یہ کہانی خُود ایک افغان صحافی کی زبانی سُن لے۔

اور حقائق سے آگاہ ہو جائے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اگر آپ واقعی کسی حد تک اس المیے کی حقیقت سے آگاہ ہو گئے ہوں تو یہ ہماری بڑی کامیابی ہو گی اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہماری کوششیں رائیگاں نہیں گئیں۔

حیرانؔ خٹک

سُرخ آندھی سے پہلے

افغانستان سے رُوس کی دلچسپی کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ چار سو برس سے رُوسی حکمران کابل پر حکومت کے خواب دیکھتے چلے آئے ہیں۔ امیر امان اللہ خان کے دَور سے افغانستان رُوس کی جانب تیزی سے جُھکتا دکھائی دیتا ہے، لیکن مکمّل رُوس نوازی کی پالیسی تیس برس پہلے اختیار کی گئی ہے۔ جب ظاہر شاہ کے دَور میں سردار داؤد خاں وزیرِ اعظم بنا۔ اسی شخص نے رُوسی حکمرانوں کے صدیوں پُرانے خوابوں کو رنگِ حقیقت اختیار کرنے میں مدد دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امریکہ اور برطانیہ وسطِ ایشیا میں اپنے مفادات سے دست بردار ہو رہے تھے۔ ان کا چھوڑا ہُوا میدان آسانی سے رُوس کے قبضے میں آ گیا۔

رُوس کو خوش قسمتی سے ظاہر شاہ جیسا "فراخ دل" بادشاہ اور داؤد جیسا "دوست نواز" وزیرِ اعظم ملا۔ بادشاہت ظاہر شاہ کے پاس تھی، مگر سیاہ وسفید کا مالک داؤد بنا ہُوا تھا۔ اس نے رُوسیوں سے مراعات حاصل کیں، ظاہر شاہ کو قیمتی تحفے اور ہدیے دلائے اور اُس کے عوض اُنہیں مُلک میں فکری زہر پھیلانے کی کُھلی چُھٹی دے دی۔ داؤد کی وزارت

مغلوں کے زمانے میں افغانستان اور روس کے درمیان طویل المیعاد سیاسی اور اقتصادی معاہدے ہوئے۔ کابل کو ماسکو سے ملانے کے لیے "دوستی" کی شاہراہیں تعمیر کی گئیں، سرنگیں کھودی گئیں۔ روس کی مدد سے کابل میں تعلیمی اور تکنیکی ادارے قائم ہوئے سینکڑوں افغان روسی وظائف پر ماسکو کے تعلیمی اور فوجی اداروں میں بھیجے گئے اور وہاں انہیں "اشتراکی جنت" کے ایسے دل فریب مناظر دکھائے گئے کہ وہ اپنے ملک کو اشتراکی بنانے کی حسرتیں لیے ہوئے وطن لوٹتے رہے۔

دوسری طرف روس آہستہ آہستہ افغانستان کے معاشی شعبوں میں بھی دخیل ہوتا رہا۔ اقتصادی معاہدوں کے ذریعے کابل کا انحصار روس پر بتدریج بڑھتا رہا اور آخر کار وہ وقت آگیا جب اس کے لیے کوئی متبادل راستہ باقی نہ رہا۔ روسی چالوں اور سازشوں کی تاریخ کو سمجھنے کے لیے افغانستان کی ساٹھ سالہ تاریخ پر ایک نظر دوڑائی جائے تو بہتر ہوگا۔

امیر امان اللہ خان

امیر امان اللہ خان نے جب محلاتی سازشوں پر قابو پا کر تختِ حکومت پر قبضہ کیا تو سب سے پہلے برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی خود مختار بادشاہت کو تسلیم کرے۔ انگریز ابھی تک اس اُمید میں تھے کہ وہ اپنی سازشوں کے ذریعے افغانوں کو حلقۂ غلامی میں لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اُنہوں نے امان اللہ خان کے خلاف معاندانہ رویّہ جاری رکھا۔ اس طرح جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جس کا اختتام انگریزی سامراج کی شکست پر ہوا۔ افغانوں نے ثابت کر دیا کہ وہ اپنی آزادی کا تحفّظ کرنا جانتے ہیں، چاہے انہیں ہزاروں قربانیاں دینی پڑیں۔ ۱۹۲۲ء میں انگریزوں نے افغانستان کی خود مختاری تسلیم کی اور دونوں حکومتوں کے درمیان سرحدی معاہدہ ہوگیا۔

۱۹۱۹ء میں لینن کی قیادت میں کمیونسٹ حکومت قائم ہوئی تو افغانستان اسے تسلیم کرنے والوں میں پیش پیش تھا۔ ۱۹۲۱ء میں امیر امان اللہ خان نے روس کے ساتھ دوستی، امن اور باہمی تعاون کے معاہدے پر دستخط کیے۔ انگریز اس بنا پر امانُ اللہ خان سے سخت نالاں تھے، مگر انہوں نے اسے روس کی طرف جھکنے سے روکنے کے لیے کوئی مثبت کوشش نہ کی، بلکہ اس کے خلاف در پردہ سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ امان اللہ نے مُلک کی ترقی اور فلاح کے لیے خاصے کام کیے، مگر انگریزوں نے اسے عوام میں غیر مقبول بنانے کے لیے اس کے ہر کام کا منفی پہلو نمایاں کیا۔ عوام انگریزی پروپیگنڈے سے متأثر ہوتے رہے۔ امانُ اللہ خان اپنی خُوبیوں کے ساتھ ساتھ مذہبی اعتبار سے آزاد خیال تھا۔ اور یہ اس کا ایسا عیب تھا جس کی وجہ سے افغانستان کا مذہبی طبقہ اِس سے نالاں رہتا تھا۔

جب امانُ اللہ خان غیر مُلکی دورے پر گیا تو اس کی تُرک نژاد ملکہ ثریّا کی حد سے بڑھی ہوئی آزادی کو افغانستان کے غیور عوام نے سخت ناپسند کیا۔ انگریزوں نے نفرت اور غم و غصّے کے شُعلوں کو مزید بھڑکایا۔ علماء کے ایک گروہ نے فتویٰ دے دیا کہ یہ شخص کافر ہوگیا ہے۔ یہ ایسا کاری وار تھا جس نے اس کی مضبُوط بادشاہت کی جڑیں اُکھاڑ دیں۔ اس کے سامنے واحد راستہ یہی رہ گیا تھا کہ وہ خاموشی سے تخت و تاج کو خیرباد کہہ دے اور یہی اُس نے کیا۔ عوام کا مقابلہ کرنے کے بجائے اُس نے جلا وطنی قبول کرلی۔

امانُ اللہ خان کی جگہ لینے کے لیے کوئی موزوں شخص سامنے نہ آیا، تو انگریزوں نے پاراچنار کے ایک ڈاکو حبیبُ اللہ کلکانی کو آگے بڑھایا۔ اُس نے انگریزوں کی حمایت سے اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ کابل کے تخت پر قبضہ کرلیا۔ حبیبُ اللہ (بچّہ سقّہ) کا نوماہی دورِ حکومت ہر لحاظ سے تاریک دور تھا۔ اس کی لُوٹ مار اور عیّاشیوں نے لوگوں کے لیے جینا دوبھر کر دیا۔ تعلیمی ادارے بند ہوگئے۔ اہلِ قلم و دانش مُلک سے ہجرت کرنے لگے۔

نادر شاہ

انگریزوں نے دیکھا کہ لوگ بچہ سقہ سے بے زار ہو گئے ہیں اور اس کے مظالم کی وجہ سے حکومتِ برطانیہ بدنام ہو رہی ہے، تو انہوں نے دوسرا مہرہ آگے بڑھایا۔ فرانس سے افغان سفیر نادر شاہ کو بلایا گیا۔ اُس نے پشاور کے بازار کلاں میں ایک گھر کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔ صوبہ سرحد کے کانگرسی خانوادے سے بھی تعاون مانگا۔ انہیں یقین دلایا گیا کہ اگر افغانستان کو بچہ سقہ کے مظالم سے نجات مل گئی، تو امان اللہ کو کابل واپس بلا لیا جائے گا۔ مطلوبہ قوت فراہم ہو جانے کے بعد نادر شاہ ۱۹۲۹ء میں ٹل، کرم ایجنسی اور خوست کے راستے کابل جا پہنچا۔ فتح کے بعد نادر شاہ نے اپنی روایت کے مطابق دوستوں کو انعام و اکرام سے نوازا اور مخالفین کو عبرتناک سزائیں دیں۔ اسی مار دھاڑ میں ایک شخص غلام نبی چرخی مارا گیا۔ غلام نبی کے مُنہ بولے بیٹے نے جو ایک طالب علم تھا، ۸ نومبر ۱۹۳۳ء کو ایک تقریب کے دَوران نادر شاہ کو قتل کر دیا۔

ظاہر شاہ کم سنی میں تخت نشین ہُوا۔ اس نے اپنے باپ کے قاتل کو ایک آہنی پنجرے میں بند کر کے شاہی محل کے سامنے ایک چبوترے پر رکھ دیا۔ کئی سال تک یہ پنجرہ وزارتِ دفاع کے احاطے میں پڑا رہا۔ کم سن ظاہر شاہ کو سرپرستی کے لیے ہاشم خان، شاہ ولی خان، اور شاہ محمود خان مل گئے۔ جنہوں نے اپنے خاندان کو تقویت دینے کے لیے ظاہر شاہ کے نام پر حکومت کی اور جب ظاہر شاہ سنِ بلوغت کو پہنچ گیا تو اختیارات اُسے سونپ دیے۔

ظاہر شاہ

ظاہر شاہ نے جوانی کا زیادہ تر وقت عیش و آرام میں گزارا جب اس پر سلطنت

کی ذمّے داریاں براہِ راست پڑیں، تو وہ اُس نے سردار داؤد کو سونپ دیں جو ظاہر شاہ کا قریبی عزیز تھا۔ اس شخص نے فرانس میں تعلیم پائی تھی۔ بادشاہ نے اسے ۱۹۵۲ء میں وزیرِ اعظم مقرر کیا اور تمام نظامِ حکومت اس کے سپرد کر کے خود عیش کرنے لگا۔ سردار داؤد کو اپنی "روشن فکری" اور "ترقّی پسندی" پر بہت ناز تھا۔ اس نے وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالتے ہی بیرونی ملکوں سے معاہدے کرنے شروع کر دیے۔ اِن میں رُوس سے متعدّد اقتصادی معاہدے خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی لبرل سوچ نے ملک کو رُوس کی طرف اتنا زیادہ جُھکا دیا کہ توازن برقرار نہ رہا اور آئندہ برسوں میں آنے والے دُوسرے لوگ کوششِ فراواں کے باوجود ملک کو رُوسی جال سے نہ نکال سکے۔

سردار داؤد نے سرکاری افسروں اور دوسرے ملازموں کو تربیت دینے کے لیے رُوسی مشیر بلائے اور افغان فوجی اور سول افسروں اور جوانوں کو اعلیٰ تربیت کے لیے ماسکو بھیجا۔ دُوسری طرف اپنے قریبی ہمسایے پاکستان سے دشمنی کے بیج بوئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پالیسی کی آبیاری بھی کی۔ داؤد کے نئے دوست رُوس اور بھارت کو اس پالیسی کے ساتھ خصوصی دلچسپی تھی اس لیے اس نے "پختونستان" کے سٹنٹ کے لیے دونوں ملکوں سے بھاری مقدار میں رقوم حاصل کیں۔ ظاہر شاہ کی آنکھوں کے سامنے ملک رُوسیوں کے قریب جاتا رہا، مگر اُسے اپنی آسائش بھری دُنیا سے باہر نکلنے کی فرصت نہ ہوئی۔

داؤد کی برطرفی

دس برس کے عرصے میں سردار داؤد اتنا مضبوط ہو گیا کہ ظاہر شاہ کو اس سے خطرے کی بُو آنے لگی۔ لہٰذا اس نے اسے برطرف کر دیا۔ ۱۹۶۴ء میں ملک کو آئین دیا گیا جس میں بادشاہ کے اختیارات میں تو کمی نہ ہوئی، لیکن شاہی خاندان کی قوّت

کمزور ہوگئی۔ آئین میں سیاسی آزادی دینے کا وعدہ بھی کیا گیا۔ قومی اسمبلی اور سینٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔ ان آزادیوں سے رُوس نے فوری فائدہ اٹھایا۔ ملک بھر میں کمیونزم کا لٹریچر عام ہوگیا اور رُوسی ایجنٹوں کو منظم کیا جانے لگا۔

داؤد کی برطرفی کے بعد یوسف خان، ہاشم میوندوال، نور محمد اعتمادی اور موسیٰ شفیق باری باری وزارتِ عظمےٰ کی کرسی پر بیٹھے، مگر اُن کے دَور میں طوائف الملوکی کا سماں رہا۔ صرف موسیٰ شفیق نے ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں۔ ہمسایہ ملک پاکستان سے بھی اچھے تعلقات قائم کرنے کی راہ اختیار کی، لیکن روسی ایجنٹ فوج اور حکومت میں اتنا نفوذ حاصل کر چکے تھے کہ کسی شخص کے لیے ان کے اثرات ختم کرنا آسان کام نہ تھا خصوصًا ایسی حالت میں جب کہ ظاہر شاہ رُوس کو اپنا دوست سمجھتا تھا اور اس کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کو اپنی کامیابی اور ملک کی ترقی کی ضمانت خیال کرتا تھا، اس کے کسی وزیرِ اعظم کے بس میں نہ تھا کہ وہ رُوس کے جادُو کو توڑ سکے۔

داؤد کی دوبارہ آمد

۱۷ر جولائی ۱۹۷۳ء کو حالات نے نئی کروٹ لی۔ بادشاہت کے خاتمے کے اعلان کے ساتھ سردار داؤد نے منصب حکومت سنبھالا۔ صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کی دونوں کرسیاں اس نے اپنے پاس رکھیں۔ حکومتی سطح پر معمولی سی کشیدگی دیکھنے میں آئی، لیکن عوام نے اس تبدیلی کا کچھ زیادہ اثر نہ لیا، لیکن جب داؤد نے تشدّد کی راہ اپنائی اور بہت سے بااثر اور اسلام دوست رہنماؤں پر پاکستان اور امریکہ کی ایجنٹی کا الزام لگا کر انہیں جیل بھیج دیا گیا اور بہت سے لوگوں کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا تو ملک بھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ داؤد کی حکومت نے اسلامی ذہن رکھنے والے اور کمیونزم کے مقابلے میں اسلام کے لیے کام کرنے والے سینکڑوں نوجوانوں کو جامِ شہادت پلایا۔ اس سے سردار

داؤد نے رُوس کی عارضی خوشنودی تو حاصل کر لی، مگر اُس کی یہی پالیسی اُسے لے ڈوبی۔

ظاہر شاہ کا تختہ اُلٹنے میں کمیونسٹ پارٹی کے پرچم دھڑے نے داؤد کی بہت مدد کی تھی۔ اس لیے بہت سے پرچمی رہنماؤں نے سردار داؤد کا قُرب حاصل کر لیا۔ داؤد نے ان لوگوں کو اپنی حکومت میں اعلیٰ مناصب پر فائز کیا۔ اُنہوں نے وہ لوٹ مچائی کہ لوگ الامان والحفیظ پُکار اُٹھے۔ بچّہ سقّہ کی طرح اُنہوں نے بھی رشوت ستانی اور ظلم و ستم کا دَور دَورہ کر دیا۔ اپنی حریف مسلمان جماعتوں کے اہم رہنماؤں اور دُوسرے مسلمانوں کے خلاف حکومت کی لاٹھی استعمال کی۔ ان کی انگیخت پر داؤد نے اسلامی تحریک کے قائدین کے خلاف ملک گیر تحریک چلائی۔ کئی مقامات پر پولیس اور فوج نے بے گناہ مسلمانوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ پنج شیر اور دوسری جگہوں میں تحریک کے کئی جوان شہید ہو گئے اور صفِ اوّل کے قائدین کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ ان میں پروفیسر غلام محمد نیازی، انجینئر حبیبُ الرحمٰن، مولوی حبیبُ الرّحمٰن اور پروفیسر عبدالرّسول سیّاف شامل تھے۔ بعد میں ان میں سے اکثر کو جیل میں شہید کر دیا گیا۔ دو اہم رہنما پروفیسر برہان الدین ربّانی اور انجینئر گلبدین حکمت یار بھی داؤد کے جبر و ستم کی وجہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے۔

سردار داؤد نے گذشتہ دَور کے کئی وزراء اور اہم شخصیّات کو بھی قتل کرا دیا۔ سابق وزیرِ اعظم محمد ہاشم میوندوال کو سازش کے الزام میں جیل میں ڈالا جہاں وزیرِ داخلہ فیض محمد اور پولیس افسر اظہر کے ہاتھوں اسے قتل کرا دیا اور باہر یہ مشہور کرا دیا کہ میوندوال نے اپنے گلے میں ٹائی ڈال کر خودکشی کر لی ہے۔ بعد میں کہا گیا کہ داؤد کو میوندوال کی "خودکشی" کا بہت دُکھ ہُوا ہے۔

سردار داؤد کابل میں رُوسی سفیر کیکتیف (KEIKTEV) کے منصُوبوں سے ایوانِ حکومت تک پہنچا تھا، اس لیے رُوس اس تبدیلی سے بہت خوش ہُوا۔ یہ الگ بات ہے

کہ کیکتیف اپنے منصوبوں کے نتائج دیکھنے کے لیے کابل میں نہ رہا اور اس کی جگہ الیگزینڈر پوزانوف (ALEXANDER POAZNOV) نے لی۔ رُوس، افغانستان کو قدم بقدم اپنے جال میں پھنسا رہا تھا۔ سردار داؤد رُوسیوں کی منزل نہ تھا بلکہ محض ایک سنگِ میل تھا۔ جو لوگ رُوسیوں کے طریقۂ واردات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ رُوس کے استعماری حکمران دوسرے ممالک کا اسی طرح شکار کرتے ہیں۔ سردار داؤد نے رُوسیوں کی خاطر شاہی جھنڈا تبدیل کیا، قومی نشان بدل ڈالا، کرنسی تبدیل کر دی اور اس طرح روایت پسند افغانوں کے دلوں سے بادشاہ کے احترام کو کھرچ ڈالا۔ رُوسی یہ بھی چاہتے تھے کہ وہ افغانستان کے راسخ العقیدہ مسلمانوں کے دلوں سے اسلام کی عظمت ختم کر دے، مگر وہ اپنے آقاؤں کی یہ خواہش پُوری کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

سردار داؤد دو برس تک پرچمیوں کے ہاتھوں میں کھیلتا رہا۔ اس کے بعد اسے اندازہ ہُوا کہ پرچمی تو رُوس کے ایما پر مکمل کیمونسٹ انقلاب کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور اُسے راستے سے ہٹانے کی سازش تیار کر لی گئی ہے، تو اس نے پرچمیوں کو سرکاری عہدوں سے علیحدہ کر دیا، مگر رُوسی اپنے مقاصد پُورے کر چکے تھے۔ داؤد کی جگہ لینے کے لیے رُوسی ایجنٹ تیّار تھے۔ افغان فوج کا ایک حصہ رُوس کے ہاتھ میں تھا۔ رُوسی جاسوسی ادارے کے جی بی اور رُوسی سفارتخانے کے ذریعے حکومت کے اندر کئی حلقے پیدا ہو چکے تھے۔ بیوروکریسی اور فوج میں رُوسی اثرات منظّم کیے جا چکے تھے اور ملک میں کیمونسٹوں کی واحد مقابل قوت، اسلامی تحریک کو دبا دیا گیا تھا۔

داؤد نے آخری دنوں میں رُوسیوں کے جال سے نکلنے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے، اُس نے رُوسیوں کی شہ پر اختیار کی ہُوئی پاکستان دشمنی کی پالیسی ترک کر دی اور پاکستان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے بعض مغربی ممالک اور عربوں سے بھی روابط قائم کیے۔ اب وہ رُوس سے دُور ہونا چاہتا تھا، رُوسی جاسوسوں کو ختم کرنا چاہتا تھا، مگر یہ سب کچھ

آسان کام نہ تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ اس نے رُوسی سنپولیے پال کر اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری ہے۔ وہ حالات کو بدلنے کا خواہش مند تھا، لیکن کابل میں رُوسی سفیر اب بے اختیار نہ رہا تھا۔ وہ نت نئے منصوبے بناتا اور لمحہ بہ لمحہ ماسکو سے نئی ہدایات حاصل کرتا تھا۔

اُدھر ماسکو سے سردار داؤد کا تختہ اُلٹنے کا فیصلہ کیا گیا، اِدھر افغانستان میں خلق پارٹی کے دونوں دھڑے متحد ہو گئے۔ دُوسری طرف سردار داؤد بھی تیزی سے اقدامات کر رہا تھا۔ اُس نے بیرونی ممالک کے خیر سگالی دَورے کیے جن میں پاکستان کا دورہ بھی شامل تھا۔ اس کے بعد اندرونِ ملک لوگوں کو قابو میں کرنے کے لیے کئی صُوبوں کا دورہ کیا۔ جن دنوں داؤد بیرونِ ملک دَوروں میں مصروف تھا، اس کے دو ہمراہیوں وزیرِ تجارت محمّد خان جلا میر اور باختر نیوز ایجنسی کے رحیم رفعت نے جو خلق پارٹی کے رُکن تھے، اس کی مصروفیات کے ایک ایک لمحے کا ریکارڈ رُوسی سفیر کے توسط سے ماسکو پہنچا دیا۔ ان دونوں نے دَورے سے واپسی پر رُوسی سفیر اور کے جی بی کو داؤد کے اس تازہ رویّے کی تمام رُوداد سنا دی جو رُوس کی مخالفت پر مبنی تھا۔ اس کے فوراً بعد ماسکو سے انقلاب کی تیّاری کرنے کے احکام آ گئے اور اپریل ۱۹۷۸ء کے آخری ہفتے میں رُوسی منصوبے کے پہلے حصّے پر عمل درآمد ہُوا۔

پرچم پارٹی کا ایک اہم رہنما میر اکبر خیبر شام کے وقت اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا کہ خلق پارٹی کے کچھ لوگوں نے اسے قتل کر دیا۔ یہ واقعہ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کے سامنے پیش آیا۔ پولیس تفتیش میں مصروف ہو گئی۔ جب لاش میر اکبر کے گھر پہنچی تو وہاں قاتل خود ہی ماتم کے لیے جمع تھے۔ خلق پارٹی کے سینکڑوں ارکان نے جنازے کو جلوس کی شکل میں کارتہ پروان ٹاؤن کی سڑکوں پر گھمایا۔ اگلے روز لاش کو مردہ خانے میں غسل دینے کے بعد پھر ایک بڑے جلوس کی شکل میں قبرستان پہنچایا گیا۔ تدفین کے وقت حکومت کے خلاف تیز و تُند نعرے لگائے گئے۔

داؤد انتظامیہ کے بعض افسروں کا خیال تھا کہ احتجاج کرنے والوں سے سختی کے ساتھ نمٹا جائے، لیکن داؤد نے اس کی اجازت نہ دی۔ مگر پھر بھی رات کو وزارتِ داخلہ کے حکم پر نور محمد ترہ کی، ببرک کارمل، دستگیر پنج شیری اور دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ریڈیو کابل نے اس اقدام سے عوام کو آگاہ کیا اور قیدیوں کو کابل کے گورنر ہاؤس کے معمولی اور غیر محفوظ قید خانے میں رکھا گیا۔

قید خانے کے باہر فوج میں کمیونسٹ پارٹی کے ارکان نے وطن جار زرتی کی قیادت میں بغاوت کی تیاری مکمل کر لی۔ سردار داؤد نے بھی خطرے کی بو سونگھ کر اپنے فہم و دانش کے مطابق اس کے تدارک کے لیے حفاظتی انتظامات بھی کر لیے تھے، لیکن روسی ہمیشہ سازش کی تیاری بڑے سائنٹیفک انداز میں کرتے ہیں۔ ۲۷ اپریل کو صبح ۹ بجے کے قریب پل چرخی کی فوجی چھاؤنی سے فوج کا ایک ٹینک بردار دستہ ایوانِ صدر کی طرف بڑھا، تو دوسری طرف فضائیہ کا عبدالقادر ڈگروال روسی ساخت کے مگ ۲۱ طیارے لے کر صدارتی محل پر جھپٹا۔ سردار داؤد نے زمینی حملوں کا مقابلہ کرنے کا سامان تو کر رکھا تھا، لیکن آسمانی آفات سے نمٹنے کے لیے وہ قطعی طور پر تیار نہ تھا۔ فضائی حملے نے داؤد کے دفاعی نظام کو تتر بتر کر دیا۔ چنانچہ جب وقت اسلم وطن جار ٹینکوں کے ایک دستے کی قیادت کرتا ہوا قصرِ صدارت پہنچا، تو اس کا کام صرف حالات کو قابو میں رکھنا تھا۔ فضائیہ کا آپریشن اتنی چابکدستی سے عمل میں آیا کہ بعد میں اس بات کا یقین ہو گیا کہ ایوانِ صدر پر حملہ کرنے والے مگ۔ ۲۱ طیاروں کے ہواباز بھی روسی تھے۔

صدارتی محل کے سامنے خونریز جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں سردار داؤد اپنے کئی وزراء اور خاندان کے کئی افراد سمیت مارا گیا۔ دو روز پہلے اس نے خلق اور پرچم پارٹیوں کے جو لیڈر نظر بند کیے تھے، انہیں رہا کرا لیا گیا اور شام کے دھندلکوں میں کمیونسٹ شہر بھر میں فتح کے شادیانے بجاتے پھرنے لگے۔

کمیونسٹ پارٹی

افغانستان میں کمیونزم کی تنظیم کا آغاز نیشنلزم کے نام پہ ہوا۔ نور محمد ترہ کی نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز "ویش زلمیان" (جوانانِ روشن فکر) نامی تنظیم سے کیا۔ اس کی بنیاد ان پشتون نوجوانوں نے رکھی تھی جو ملک کی دوسری زبانوں پر پشتو کی بالادستی کے دعویدار تھے۔ "پشتون ازم" ان کی پارٹی کی بنیاد تھا اور صرف پشتو بولنے والے قبائل کے لوگ ہی اس پارٹی کے ممبر بن سکتے تھے۔ دوسری زبانیں، مثلاً دری، تاجک اور ازبک بولنے والوں پر اس پارٹی کے دروازے بند تھے۔ آگے چل کر ان لوگوں میں اندازِ فکر کی یکسانیت نہ رہی اور پارٹی مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ "افغان ملت" نامی گروہ کی قیادت غلام محمد فرہاد نے سنبھال لی اور محمد ہاشم میوندوال "مساوات" کے نام سے الگ ہونے والے گروپ کی رہنمائی کرنے لگا۔ اسی زمانے میں کچھ زیادہ ترقی پسند نوجوان ترہ کی کے گرد جمع ہو گئے اور "پیپلز ڈیموکریٹک پارٹی" (خلق) کی بنیاد رکھی۔ قومیت پرستی کے ساتھ ساتھ اس پارٹی نے کمیونزم کی فکر اور اصولوں پہ چلنے کا اعلان کیا۔

ببرک کارمل بھی جو سکول کی تعلیم کے زمانے سے ہی روسی لٹریچر پڑھنے کی وجہ سے معروف ترقی پسند سمجھا جاتا تھا "خلق" میں شامل ہو گیا۔ اس وقت وہ کالج کا طالب علم تھا۔ پارٹی کے بنیادی ارکان کی کل تعداد دس افراد پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ سرتاپا روسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ روسی سفارتخانہ ان پہ عنایات کی بارش کرتا رہتا تھا۔ ابتدائی چند سال کمیونسٹ پارٹی نے خاموشی سے گزارے۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۴ء میں جب پارٹی کے اراکین کی تعداد ایک سو کے قریب جا پہنچی، تو بنیادی کانگرس کا پہلا اجلاس ترہ کی نے اپنے گھر میں منعقد کیا۔ اس موقع پہ پارٹی کے اراکین کو "خوشخبری" سنائی گئی کہ روس نے یقین دلایا ہے کہ اس کی فکری رہنمائی اور اقتصادی مدد ہمیشہ خلق پارٹی کو حاصل رہے گی۔ کچھ عرصے تک پارٹی میں اتحاد و

اتفاق کی فضا قائم رہی، لیکن جوں ہی حفیظ اللہ امین نے شمولیت اختیار کی، ببرک کارمل اس کا مخالف ہوگیا اور پارٹی میں منافقت کا سلسلہ چل پڑا۔

ترہ کی اور امین کے خیالات میں نسبتاً زیادہ ہم آہنگی تھی۔ وہ دونوں کمیونسٹ پارٹی میں پشتو بولنے والے نوجوانوں کی شمولیت کے خواہاں اور دُوسری زبانیں بولنے والوں سے گریزاں تھے۔ کارمل نے ابتدا میں اس پالیسی پر نکتہ چینی کی اور بعد میں اس کی امین سے باقاعدہ ٹھن گئی۔ رفتہ رفتہ ان کے درمیان اختلافات اتنے بڑھے کہ کئی مرتبہ ہاتھا پائی بھی ہوئی۔ اس کے بعد پارٹی کی قیادت کا مسئلہ بھی متنازع فیہ ہوگیا۔ ببرک کارمل جسے شعلہ بیانی اور مضبوط موقف کی بنا پر پارٹی کے ایک دھڑے میں رسُوخ حاصل تھا، قیادت میں اپنا حصہ مانگنے لگا۔ لیکن ترہ کی کسی صُورت میں قیادت کے منصب سے ہٹنا نہ چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ کارمل نے یہ مطالبہ بھی کیا کہ امین کی تندئ طبع پارٹی کے لیے ضرر رساں ہے اس لیے اسے نکال دیا جائے۔ ترہ کی ذہنی طور پر امین کے زیادہ قریب تھا۔ وہ اسے اپنا نائب رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے کارمل کے مطالبات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پارٹی دو ٹکڑوں میں بٹ گئی۔ پارٹی کے دو سو کے قریب ارکان میں سے ایک چوتھائی ترہ کی اور امین کے ساتھ رہے۔ باقی تین چوتھائی نے کارمل کی قیادت میں پارٹی کے نئے دھڑے "پرچم" کی تشکیل کی۔ ترہ کی کا ساتھ دینے والوں میں امین کے علاوہ ڈاکٹر شاہ ولی، پروفیسر محمود سوما اور انجینئر دانش وغیرہ شامل تھے جب کہ کارمل سلطان علی کشتمند، میر اکبر خیبر، سلیمان لائق، اناہتیا راتب زادہ، دستگیر پنج شیری اور نظام الدّین تہذیب کو ساتھ لے گیا۔

ترہ کی اور اس کے ساتھی نظریاتی طور پر کمیونسٹ تھے، مگر سوشلزم کے بارے میں انہیں بہت کم معلُومات حاصل تھیں اور وہ سیاسی نشیب و فراز سے بھی کچھ زیادہ واقف نہ تھے۔ رُوس کو ان سے محض اس وجہ سے دلچسپی تھی کہ وہ پشتون ازم کے داعی ہیں اور رُوس پشتونستان کے مسئلے کو ہوا دینا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ترہ کی اور اُس کے ساتھی رُوسی

سفارت خانے سے اپنی سرگرمیوں کے لیے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شاہ ولی اور محمد اکبر دانی جیسے متموّل لوگ بھی انہیں مالی مدد فراہم کرتے رہے۔ یہ رقوم پارٹی کے بڑے آپس میں بانٹ لیتے تھے۔

ترہ کی اور امین نے اپنی تمام تر توجّہ کابل کے خوشحال خان اور رحمان بابا نامی تعلیمی اداروں پر مرکوز کر دی، جہاں پختون قبائلیوں کے بچے زیرِ تعلیم تھے۔ عصبیت کی آگ بھڑکائی گئی اور اس طرح کچھ خام ذہنوں کے نوجوان شکار کر لیے گئے۔

دوسری طرف کارمل کے دھڑے کے لوگ سکّہ بند کمیونسٹ تھے۔ رُوسی جاسوسی ادارہ کے جی بی ان کا خُفیہ سرپرست تھا۔ اس پارٹی کے اکثر لوگ کابل کے امیر گھرانوں سے تعلّق رکھتے تھے۔ کارمل نے اپنی شعلہ بیانی سے فارسی بولنے والے طبقے کو متاثّر کیا۔ پشتو بولنے والے لوگ اس کے قریب آنے سے کتراتے تھے۔ کئی برس تک دونوں گروپ الگ الگ اپنی قوّت میں اضافہ کرتے رہے۔ مجموعی طور پر پرچم دھڑا غالب رہا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ۱۹۷۸ء میں "سُرخ انقلاب" کے وقت پرچم پارٹی کی رُکنیت ۲۹۸۳ تھی جب کہ "خلق" کے ارکان کی کل تعداد ۱۵۰۰ تھی، ان میں ۱۰۰ عورتیں تھیں۔

رُوس نے "خلق" اور "پرچم" دونوں پر اپنی عنایات کی بارش کر دی۔ دونوں اس کے غلام بن چکے تھے اور اسے اپنی اُمیدوں کا مرکز خیال کرتے تھے۔ جب کریملن نے دیکھ لیا کہ دونوں دھڑے قابلِ لحاظ قوّت حاصل کر چکے ہیں، تو ان کے لیڈروں کو حکم ملا کہ وہ مُتحد ہو جائیں۔ ۱۹۷۷ء کے اواخر میں دونوں پارٹیوں کے درمیان اتّحاد ہو گیا۔ معمّر ہونے کی بنا پر ترہ کی کو مُتحدہ پارٹی کا سربراہ چُنا گیا۔ ترہ کی اس منصب کے لیے اس لیے بھی موزوں تھے کہ وہ سوشلسٹ اور نیشنلسٹ دونوں حلقوں میں یکساں مقبول تھا۔ پالیسی کے لحاظ سے ترہ کی اور کارمل کی سوچ میں اختلاف باقی رہا۔ کارمل مکمل "خود سپردگی" کا

قائل تھا جب کہ ترہ کی رُوس کی مدد سے برسرِاقتدار آکر تسلّط اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔ رُوسی فی الحال ایسا ہی آدمی چاہتے تھے۔ وہ کارمل کو مستقبل میں کام آنے والا مہرہ قرار دے چکے تھے۔ لیکن ترہ کی ان کے نزدیک ایسا شخص تھا جسے عارضی طور پہ داؤد کے جانشین کی حیثیت سے کابل کے تخت پر بٹھایا جا سکتا تھا۔

نُور محمّد ترہ کی

نور محمّد ترہ کی مُقر کے علاقے میں سلیمان خیل نامی قبیلے سے تعلّق رکھنے والے ایک غریب خاندان میں پیدا ہُوا۔ اس کے خاندان کے لوگ بھیڑ بکریاں چُراتے تھے۔ ترہ کی کو اپنے والدین کا پیشہ پسند نہ تھا اس لیے اُس نے حصولِ علم کی طرف توجّہ دی، لیکن غربت کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ وہ نوجوانی میں گھر چھوڑ کر کابل چلا گیا۔ یہاں اسے ایک دفتر میں چپڑاسی کی نوکری ملی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ محکمہ انحصارات (MONOPOLY DEPARTMENT) میں منشی بھرتی ہُوا۔ اس عہدے سے ترقّی کرتا ہُوا وہ افغانستان کی سرکاری تجارتی کمپنی کا نمائندہ بن گیا۔ اس کمپنی کے ساتھ بھارت گیا۔ وہاں اس نے میٹرک کا پرائیویٹ امتحان دیا۔ اسی زمانے میں ترہ کی اشتراکیت کی طرف مائل ہُوا۔ وطن واپس آنے کے بعد اسے امریکہ میں افغان سفارت خانے میں ملازمت مل گئی۔ امریکہ جا کر ترہ کی نے رُوسی سفارت کاروں سے پینگیں بڑھائیں۔ وہاں اس نے کابل حکومت کے خلاف باتیں کیں، تو ظاہر شاہ حکومت نے اسے واپس بلا لیا۔ یُوں سرکاری ملازمت اس کے ہاتھ سے جاتی رہی، لیکن اب وہ نوکری کے لیے بے نیاز تھا۔ کچھ عرصے کے بعد وہ علاج کی غرض سے ماسکو چلا گیا۔ یہاں اس نے رُوسی افسروں سے مسلسل ملاقاتیں کیں۔ اسی زمانے میں ترہ کی نے اپنے مستقبل کا فیصلہ کر لیا۔

رُوس سے واپسی پر ترہ کی نے کھُل کر اشتراکیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ اپنے خیالات

کی اشاعت کے لیے اس نے "خلق" کے نام سے ایک جریدہ نکالا جو اس کے ایک قریبی دوست بارق شفیع کی ادارت میں شائع ہوتا تھا۔ اس نے چند کتابیں بھی لکھیں جن میں اس کے ایک ناول "دبنگ مسافرے" کو خاصی شہرت ملی۔

حفیظ اللہ امین

ترہ کی کے دستِ راست اور بعد میں اس کے قاتل حفیظ اللہ امین کا تعلق دارالحکومت کابل کے قریب پغمان نامی بستی سے تھا۔ اس کا باپ ایک متمول زمیندار تھا۔ امین نے ابتدائی تعلیم پغمان میں حاصل کی۔ سکول اور کالج کی تعلیم کے لیے کابل، اور اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گیا۔ اس کی تعلیم کے اخراجات ظاہر شاہ کی حکومت نے برداشت کیے۔ امریکہ سے واپسی پر امین ٹیچرز اکیڈمی میں استاد مقرر ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں اس نے خلق پارٹی میں شمولیت اختیار کی۔ روسی سفارت خانے سے قریبی تعلقات کی بنا پر اسے شروع سے پارٹی میں اہم حیثیت حاصل رہی اور جب کمیونسٹ برسرِ اقتدار آئے، تو وہ نائب وزیرِاعظم پھر وزیرِاعظم اور بعد میں صدر کے عہدوں تک جا پہنچا۔

ببرک کارمل

روسی ایجنٹوں میں تیسری اہم شخصیت ببرک کارمل کی تھی۔ وہ مضافاتِ کابل میں سے کمری نامی گاؤں کا باشندہ ہے۔ اس کے والد جنرل محمد حسین کا شمار ظاہر شاہ حکومت کے اہم ستونوں میں ہوتا تھا۔ اپنے والد کی وجہ سے کارمل کو حکومت کے اعلیٰ افسروں سے تعلقات بڑھانے کا موقع ملا۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ باپ کو کارمل کی "ترقی پسندی" ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ کارمل نے پرچم پارٹی کا رہنما بننے کے بعد اعلیٰ سرکاری عہدیداروں سے اپنی دوستی کا خوب فائدہ اٹھایا۔ پریس کو آزادی ملی تو کارمل نے اپنے زرخیز دماغ سے

کام لے کر حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا اور اس طرح رُوسی دربار میں اپنی ساکھ کو مضبوط کیا۔ جس زمانے میں سردار داؤد وزارتِ عظمیٰ سے نکل کر بے کاری کے دن کاٹ رہا تھا، کارمل نے اس سے بھی رابطہ استوار کر لیا۔ یہی وجہ تھی کہ داؤد کے دور میں پرچمیوں کو بہت مراعات ملیں۔ یہ ببرک کارمل ہی تھا جس نے سردار داؤد کی رُوس نوازی سے فائدہ اُٹھاتے ہُوئے ملک کی فضا اسلام کے حامیوں پر تنگ کر دی۔

نظریے کے لحاظ سے کارمل مارکسزم پر یقین رکھتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں غالی ہے۔ اس کا بس چلے تو وہ پُورے مُلک کو کمیونزم کا نسخہ گھول کر پلا ڈالے۔ مزاج کے لحاظ سے وہ تُند خُو ہے۔ شعلہ بیان مقرر ہے۔ داؤد کے دور میں دو مرتبہ پارلیمنٹ کا رُکن رہا ہے، اس لیے عام لوگ اس کے کردار اور افکار سے اچھی طرح آگاہ ہیں۔

خونیں شام

۲۷ر اپریل ۱۹۷۸ء کی شام ترہ کی ایوانِ حکومت میں جا پہنچا۔ اس طرح روسی نیتاؤں کا صدیوں پہلے دیکھا ہوا خواب پُورا ہو گیا۔ اس خونیں سازش کو "انقلابِ ثور" کا نام دیا گیا۔ اور عوام کی فتح سے تعبیر کیا گیا، یہ الگ بات ہے کہ اس میں سرے سے کوئی عوامی طبقہ شریک ہی نہ تھا۔ "انقلابی پارٹی" کے ارکان کی کُل تعداد چار ہزار تھی، لیکن کابل میں رُوس کے فوجی مشیروں کی تعداد آٹھ ہزار سے متجاوز تھی۔

نئی انتظامیہ کو تسلیم کرنے والوں میں رُوس پیش پیش تھا۔ ماسکو نے نئی انقلابی کونسل کی بھرپور حمایت کا اعلان کیا اور اُس کے ایجنٹوں نے ریڈیو کابل کی محدود نشریات کے سوا تمام ذرائع ابلاغ پر پابندی عاید کر دی۔ عوام کو آگاہ کیا گیا کہ داؤد اور اُس کے وزراء اور بعض دوسرے لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے، کچھ "انقلاب دشمن" مارے گئے ہیں اور فوج اور سول انتظامیہ کے لوگ دل و جان سے انقلابیوں کے وفادار ہیں۔ اس کے بعد مملکت کا نام تبدیل کر کے "ڈیموکریٹک ریپبلک آف افغانستان" رکھ دیا گیا۔ صدارت،

وزارتِ عظمیٰ اور دُوسرے اہم عہدوں پر خلق اور پرچم کے رہنماؤں کا تقرر ہُوا۔ حکمرانوں نے فتح کا جشن کرفیو کے اندھیروں اور جبرواستبداد کے سایوں میں منایا۔ اس کے معاً بعد گرفتاریوں کا ملک گیر سلسلہ شروع ہُوا۔ ہر اُس شخص کو پکڑ لیا گیا جس سے کمیونسٹ مخالفت کا اندیشہ تھا۔ صدارتی محل کی قیمتی اشیاء انقلابی کارکُن اور رُوسی مشیر لُوٹ کر لے گئے۔ داؤد اور اُس کے خاندان کی تمام جائیداد قومی ملکیّت میں لے لی گئی اور اس کے گھر کے سازو سامان پر خلق اور پرچم کے کارکنوں نے قبضہ جما لیا۔

نئی انتظامیہ میں نور محمد ترہ کی انقلابی کونسل کا چیئرمین ہونے کے علاوہ وزیرِاعظم اور پارٹی کا سربراہ مقرر ہُوا۔ خلق کا حفیظ اللہ امین نائب صدر اور پرچم کا ببرک کارمل نائب وزیرِاعظم بنا۔ ترہ کی کا ثاگردِ وفادار ہونے کے صلے میں امین کو وزارتِ خارجہ کا اضافی قلمدان بھی تفویض ہُوا۔ بغاوت میں اہم کردار ادا کرنے والے بریگیڈیر عبدالقادر اور اسلم وطن جار بھی کابینہ میں شامل کر لیے گئے۔

پُرانے زخم ہرے ہو گئے

داؤد کے زمانے میں خلقیوں اور پرچمیوں کے درمیان اختلافات دب گئے۔ کیونکہ رُوس چاہتا تھا کہ اس کے تمام ایجنٹ مل کر اقتدار تک پہنچیں، لیکن جب اقتدار کمیونسٹوں کو مل گیا، تو پُرانے اختلافات تازہ ہو گئے۔ ترہ کی اقتدار پر بلا شرکتِ غیرے تصرف حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جب تک اس کے حریف اقتدار میں شریک ہیں، "بابائے انقلاب" کہلانے کا اس کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ ادھر پرچمیوں کی گستاخیاں روز بروز بڑھتی چلی گئیں۔ وہ اسے کارمل کے مقابلے میں کمتر خیال کرتے تھے، چنانچہ ترہ کی نے اپنے اختیارات کام میں لاتے ہُوئے کارمل اور اُس کے ساتھیوں سے نمٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ کابل میں موجود رُوسی مشیروں نے دونوں گروہوں کے درمیان صلح صفائی کی کوششیں

لیں مگراس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ترہ کی نے ان سب کو اقتدار سے ہٹاکر مختلف ممالک میں سفیر بناکر بھیج دیا، مگراس اقدام سے اس کی مشکلات میں کمی نہ آئی۔ ان لوگوں نے بیرونِ ملک جاکراس کے خلاف سازشوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ بالآخریہی سازشیں اس کو لے ڈوبیں۔

روسی چاہتے تھے کہ پرچمی رہنا بیرونِ ملک اُن کے لیے کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا کردیں۔اس لیے ان سب کو اپنی اپنی جگہ یقین دلایا گیا کہ رُوس ان کے ساتھ ہے، وہ عبوری دور کے لیے ترہ کی کے وفادار رہیں۔ کارمل اور اُس کے ساتھیوں نے روسیوں کو اپنے تعاون کا یقین دلایا، لیکن جب ترہ کی نے کابل میں کچھ پرچمیوں کو حراست میں لے کران کے خلاف پروپیگنڈے کا آغاز کردیا اور یہ کہا جانے لگاکہ کارمل اوراس کے ساتھی امریکی پٹھو اور امپیریلزم کے حامی ہیں، تو بیرونِ ملک پرچمیوں میں شدید اشتعال پھیل گیا۔ اُنہوں نے ترہ کی کے خلاف انقلاب کی تیاریاں شروع کردیں۔ جب ترہ کی نے سازشیوں کو ملک واپس بلانا چاہا تو اُنہوں نے ماسکو کے سفارت خانوں میں پناہ لے لی۔

اقتدار میں آنے کے بعد سے ترہ کی نے ایک دن بھی اطمینان کا سانس نہ لیا۔ ایک طرف مجاہدین اس کا دن کا چین حرام کیے ہوئے تھے، تو دُوسری طرف اس کے کمیونسٹ حریف راتوں کا سکون لوٹ رہے تھے۔ سازشیوں کا مرکزی کردار عبدالقادر جس نے ظاہرشاہ کا تختہ اُلٹ کر داؤد کو برسرِ اقتدار آنے میں مدد دی تھی اور پھر داؤد کی لاش پر ترہ کی کا ایوانِ اقتدار سجایا تھا۔ اب ترہ کی کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے کرنل رفیع، سلطان علی کشتمند اور پرچم پارٹی کے بعض دُوسرے لیڈروں کے ساتھ مل کر بغاوت کا منصوبہ تیار کیا، مگر ترہ کی خبردار تھا۔ سازش ناکام ہوگئی اور جنرل عبدالقادر اپنے ساتھیوں سمیت گرفتار ہوگیا۔

پرچمی رہنا سنگین بغاوتوں اور سازشوں کے الزام میں جیل پہنچتے رہے، لیکن روسیوں

نے انہیں ترہ کی کے عتاب سے محفوظ رہنے میں مدد دی۔ پل چرخی جیل جو مجاہدین کے لیے مقتل کی صورت اختیار کر گیا تھا اور جہاں پرامن شہریوں کو شدید اذیتیں دے کر شہید کیا جا رہا تھا، پرچمی وہاں پہنچ کر بھی زندہ رہے کیونکہ جیلوں کا اصل کنٹرول رُوسیوں کے ہاتھ میں تھا۔ ترہ کی اپنے دشمنوں کو کچلنا چاہتا تھا، لیکن اس کے رُوسی آقا اسے اپنے ایجنٹوں کے لہو سے ہاتھ رنگنے کی اجازت کیسے دے سکتے تھے۔ کابل میں رُوسی شاطروں کی بساط بچھی تھی اور وہ مہروں کو آگے بڑھانے اور پیچھے ہٹانے کا فن خوب جانتے تھے۔

ترہ کی نے کرسیٔ اقتدار کو مضبوط کرنے کی خاطر جتنی کوشش بھی کی، افغانستان اسی قدر اس کے ہاتھ سے نکل کر روسیوں کے قبضے میں جاتا رہا۔ اس نے مُلک کا نام بدلا، قومی نشان تبدیل کیا، جھنڈا بدل ڈالا، کرنسی تبدیل کر دی اور مقبولیت حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ لوگ دُور دراز سے ٹرکوں میں بھر کر کابل لائے جاتے اور وہ ان کے سامنے طویل اور بے معنی تقریریں کرتا۔ باہر سے آنے والے بعض لوگوں کو پہلے سے تیار شدہ مسودے دے کر ان سے اپنی تعریف و توصیف کراتا۔ اس طرح وہ بزعم خود دُنیا کو یہ تأثر دیتا رہا کہ ملک کے عوام اور قبائلی رہنما اُس کے ساتھ ہیں، لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں میں اس کے خلاف غم و غصہ بڑھتا ہی رہا۔ ملک کے مختلف علاقوں میں کمیونسٹوں کے خلاف ابتدا میں جو معمولی سی مزاحمت اُبھری تھی، وہ مُلک کے کونے کونے میں پھیل گئی۔ جب اسے یہ مخالفت ختم کرنے کا کوئی دُوسرا راستہ نظر نہ آیا، تو رُوسیوں کے تعاون سے اس نے دیہاتی علاقوں میں شدید بمباری کرائی۔ ہزاروں بے گناہ شہید ہو گئے۔ سینکڑوں بستیاں ویرانے کے ڈھیروں میں تبدیل ہو گئیں۔ ہزاروں افراد اپنا ملک چھوڑ کر پاکستان اور ایران کی سرحدیں عبور کرنے لگے۔ اس طرح وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتا چلا گیا۔

زرعی اصلاحات

عام لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ترہ کی نے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا۔ زمین کی تقسیم کا کام شروع ہوگیا۔ یہ ایک ناقص کام تھا۔ افغانستان میں کھیتی باڑی کے لیے پانی زیادہ مقدار میں نہیں ہے۔ اس لیے کسی شخص کے پاس زیادہ زمین ہو بھی تو اس سے بمشکل اس کے خاندان کی کفالت ہوتی ہے۔ وہاں کوئی شخص محض زمین کی بنا پر جاگیردار یا سرمایہ دار نہیں ہوتا۔ لیکن ترہ کی لوگوں کو سوشلزم کی "برکات" دکھانا چاہتا تھا۔ اس کے کارندوں نے اصلاحات کے پردے میں راسخ العقیدہ مسلمانوں اور کمیونزم دشمنوں سے انتقام لیا۔ ہزاروں لوگوں کو بلاجرم جیلوں میں پہنچا دیا گیا۔ ان کی جائز ذرائع سے کمائی ہوئی جائیدادوں کو ضبط کر لیا گیا۔ جیلوں میں ایسے لوگوں کو مقدمات چلائے بغیر ختم کر دیا جاتا اور ان کے بعد ان کے گھروں پر خلق پارٹی کے غنڈے ڈاکے ڈالتے اور تمام مال و اسباب لوٹ کر لے جاتے تھے۔

زمین سے متعلق بنائے گئے قوانین سے غریب کاشت کار مزید غریب ہو گئے۔ وہ لوگ جو سال بھر کی محنت و مشقت سے اپنے خاندان کے لیے قوتِ لایموت حاصل کرتے تھے وہ اس سے محروم کر دیے گئے۔ عام لوگوں کے لیے اراضی کے ایک محدود رقبے سے زیادہ رکھنا ممنوع قرار دیا گیا، لیکن کمیونسٹوں پر ناجائز ذرائع سے دولت کمانے اور دوسروں کی زمینیں ہتھیانے کے دروازے کھل گئے۔ اس چیز نے جگہ جگہ دشمنیوں کو جنم دیا۔ لوگ جب انتظامیہ کی سازش کو سمجھ گئے تو انھوں نے زرعی قوانین کا بائیکاٹ کر دیا۔ نتیجتاً نئے انتظامات کو کالعدم قرار دیتے ہوئے سابقہ معاملات کو بحال کر دیا گیا اور تقسیم شدہ اراضی پرانے مالکوں کو واپس کی جانے لگیں۔

دسمبر ۱۹۷۸ء میں ترہ کی نے روس کا دورہ کیا۔ اس موقع پر روسیوں نے اس

سے ایک ایسے معاہدے پر دستخط لیے جس کے ذریعے انہیں بعد میں افغانستان میں اپنی فوج اُتارنے کا حق حاصل ہو گیا۔ اس معاہدے پر رُوس کی طرف سے برزنیف نے دستخط کیے۔ حفیظ اللہ امین اور کوسیگن بھی اس موقعے پر موجود تھے۔ اِس مُعاہدے کے بعد جب ترہ کی اور امین واپس آئے، تو بظاہر کچھ لوگوں نے ان کی بصیرت کی داد دی، لیکن عوام کے ہر طبقے نے قوم فروشوں پر پھٹکار بھیجی۔

امریکی سفیر کا قتل

اسی زمانے میں ترہ کی انتظامیہ نے رُوس کے اشارے پر امریکی سفیر ادلف ڈبز (ADOLF DUBZ) کو قتل کرا دیا۔ ڈبز رُوسی حکمتِ عملی کا ماہر تھا اور اسے داؤد کے خاتمے کے فوراً بعد سفیر مقرر کیا گیا تھا۔ امریکی اس کے ذریعے رُوسی مداخلت کے قریب رہ کر ان کے اقدامات کا توڑ کرنا چاہتے تھے۔ رُوس ان کی چالوں سے خبردار تھا۔ ایک دن جب ڈبز گاڑی میں گھر سے نکلا، تو مسلّح نقاب پوشوں نے اسے گاڑی سمیت اغوا کر کے کابل ہوٹل پہنچا دیا۔ سفیر کو ہوٹل کی دُوسری منزل پر لے جایا گیا۔ جہاں "کے جی بی" کے ایجنٹ اور رُوسی مشیر پہلے سے موجُود تھے۔ ہوٹل کو پولیس نے گھیرے میں لے لیا۔ امریکی سفارت خانے کے عملے کو اندر جانے اور یرغمال بنانے والوں سے رابطے کی اجازت نہ دی گئی۔ اس موقعے پر سرکاری بیان میں کہا گیا کہ یرغمال بنانے والے امریکی سفیر کی رہائی کے بدلے میں اپنے لیڈر مولوی بائیس کو رہا کرانا چاہتے ہیں۔ بیان میں یہ بھی مزید کہا گیا کہ یرغمال بنانے والوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر حکومت نے ان کے لیڈر کو رہا نہ کیا تو وہ سفیر کو قتل کر دیں گے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ مولوی بائیس بہت پہلے تہِ تیغ کیے جا چکے تھے اور ان کے تمام ساتھی اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے، لیکن ماسکو اور کابل کے اس مشترکہ ناٹک کی کامیاب تکمیل کے لیے چار بے گناہ قیدی پہلے

ہی ہوٹل پہنچائے جا چکے تھے۔ رُوسی مشیروں نے یہ تاثر دیا کہ وہ امریکی سفیر کو بچانے کی پُوری کوشش کر رہے ہیں، لیکن ڈرامے کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ ایک گاڑی سے چند مسلح رُوسی فوجی اُترے، وہ تیزی سے ہوٹل کے اندر داخل ہُوئے اور ہوٹل کے اندر اور باہر فائرنگ شروع کر دی گئی۔ رُوسی فوجی مشیروں نے امریکی سفیر کو پہلے ہی ٹھکانے لگا دیا تھا، اس موقعے پر انھوں نے چاروں بے گناہ قیدیوں کو بھی گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ اس کے بعد نہایت افسوس کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا کہ چار مسلح افراد نے ڈبز کو قتل کر دیا ہے اور یہ حملہ آور خود بھی محافظوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔ یہ تعجب خیز بات بھی کہ بے تحاشا چلنے والی گولیوں نے صرف امریکی سفیر کی جان لی، یا چار مسلح افراد ہی کو نشانہ بنایا کوئی دُوسرا شخص ان سے زخمی نہ ہُوا۔ حقیقت یہ تھی کہ سچ بنانے کے لیے کسی کو زندہ نہ رہنے دیا گیا۔ یہ سوشلسٹ ممالک کی دیرینہ روایت ہے کہ جب وہ کسی بے گناہ شخص کو قتل کرتے ہیں تو اس کے لیے تیار کردہ ڈرامے میں حصہ لینے والے تمام کرداروں کو بھی ختم کر دیا جاتا ہے تاکہ راز ہمیشہ راز رہے۔

شیعہ کشی

کابل کے مرکزی محلّے چنداول کا واقعہ بھی افغان عوام کبھی فراموش نہ کر سکیں گے۔ اس محلّے میں اہلِ تشیّع خاصی تعداد میں آباد تھے۔ ان لوگوں پر مظالم کا آغاز ہُوا تو انھوں نے انتظامیہ کی پالیسیوں پر تنقید کرنے کے لیے جلوس نکالا۔ مظاہرین نے تره کی سے مطالبہ کیا کہ ان کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے پہلے حقیقتِ حال کی تحقیق کی جائے۔ اس مطالبے کا جواب ٹینکوں، بکتر بند گاڑیوں اور ہیلی کاپٹروں نے دیا۔ پُورے محلّے پر بے رحمی سے گولہ باری کی گئی۔ سینکڑوں افراد کو انتہائی سفاکانہ انداز سے ختم کر دیا گیا۔ جلوس پر اندھا دُھند فائرنگ سے بہت سے لوگ تو موقع پر شہید ہو گئے، باقیوں

کو پکڑ کر جیل خانوں میں بند کر دیا گیا۔ ان قیدیوں کی اکثریت آج تک اپنے گھروں کو واپس نہیں آئی۔

فوجی بغاوت

کابل کے ایک فوجی مرکز بالاحصار میں فوجیوں نے ترہ کی حکومت کے ظالمانہ اور اسلام دشمن اقدامات کے خلاف بے چینی کا اظہار کیا، تو اُسے بھی بے رحمی سے دبا دیا گیا۔ رُوسی فوجی ٹینکوں کا ایک دستہ لے کر ان پر حملہ آور ہُوئے۔ گن شپ ہیلی کاپٹروں کے ذریعے قلعے کی عمارت پر گولیاں چلائی گئیں۔ فوجیوں نے کچھ دیر تک مزاحمت کی، لیکن چند گھنٹوں کی جنگ کے بعد رُوسی فوجی غالب آگئے۔ ان فوجیوں میں سے اکثر کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا، مگر ریڈیو کابل نے یہ اعلان کیا:

"بالاحصار میں کچھ ایرانی اور پاکستانی جاسوس اکٹھے ہو گئے تھے۔ یہ لوگ تخریب کاری کے لیے بھیجے گئے تھے۔ ہمارے فوجیوں نے انہیں نیست و نابُود کر دیا ہے۔"

اس موقعے پر بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا گیا تھا۔ آج تک اُن قیدیوں کا کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں ہیں۔

ملک کے گوشے گوشے میں فوجی بغاوت کے واقعات عام ہوتے گئے۔ عوام کے مختلف طبقوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ رُوسی فوجی مشیروں کے اشاروں پر ناچنے والے ایجنٹوں نے ہر احتجاج کا جواب گولی سے دیا۔ اُدھر مجاہدین نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دیں۔ رُوس اور اُس کے پٹھو غیظ و غضب سے دیوانے ہو گئے۔ انہوں نے شہروں اور دیہات پر بے رحمی سے بمباری کی۔ بے گناہ مردوں اور عورتوں، بوڑھوں اور بچوں کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا۔ اس آگ سے وہ گھر بھی محفوظ

نہ رہ سکے جنہوں نے اس کے بھڑکانے میں خود بھی حصّہ لیا تھا۔ رُوس کا دام ہم رنگ زمیں ان کی سمجھ میں بھی آ گیا تھا، مگر بہت دیر ہو چکی تھی، اب کیا ہو سکتا تھا۔

ترہ کی کا انجام

۱۹۷۵ء کے وسط میں کیوبا کے شہر ہوانا میں غیر جانب دار تحریک کی سربراہی کانفرنس ہُوئی۔ نور محمّد ترہ کی رُوس کے راستے ہوانا پہنچا اور کابل واپس آتے ہُوئے بھی ماسکو سے ہو کر آیا۔ اس سفر میں اس کے ساتھ نائب وزیرِ اعظم شاہ ولی اور وزیرِ اطلاعات خیال محمّد کتوازی بھی تھے۔ یہ دونوں امین کے خاص آدمی تھے۔ کریملن میں ترہ کی سے برزنیف کی ملاقات کے موقعے پر ان دونوں کو باہر بٹھا دیا گیا، حالانکہ برزنیف کے ساتھ وزیرِ اعظم کوسیگن اور وزیرِ خارجہ گرومیکو موجُود تھے۔ پروٹوکول کے مطابق ترہ کی کے ساتھ بھی کسی وزیر کو مذاکرات میں شریک ہونا تھا۔ لیکن کریملن کی انتظارگاہ میں بیٹھے ان دونوں وزیروں کو کسی نے پُوچھ کر بھی نہ دیا۔ ترہ کی کو امین کے ساتھیوں سے دُور رکھ کر رُوسی دراصل اُسے امین سے دُور کرنا چاہتے تھے۔ اور اس کی جگہ کارمل کو لا کر اسے اقتدار میں شریک کرنا چاہتے تھے۔ ترہ کی سے اس موقع پر صاف لفظوں میں کہہ دیا گیا کہ "وہ امین کو سفیر بنا کر باہر بھیج دے، کیونکہ رُوس کے خیال میں مجاہدین سے نمٹنے کے لیے کارمل ہی موزوں شخص ہے۔" اِدھر امین نے جب یہ سُنا کہ ترہ کی سے برزنیف کی ملاقات کے دوران اس کے ساتھیوں کو باہر بٹھا دیا گیا تھا، تو اُس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ یہ بات پہلے ہی جانتا تھا کہ رُوسی اسے پسند نہیں کرتے اور کارمل کو ہر قیمت پر کابل واپس لانا چاہتے ہیں۔ اُس کے مخبروں نے اسے مزید ہراساں کیا۔ اسے بتایا گیا کہ جُوں ہی وہ ترہ کی کے استقبال کے لیے ہوائی اڈّے پر جائے گا، اُسے گرفتار کر لیا جائے گا۔

امین نے پیش قدمی کی۔ ہوائی اڈے پر استقبالی پروگرام میں ردّ و بدل کر دیا گیا۔ وہ مُعیّنہ وقت سے خاصی تاخیر سے آیا۔ کابل ایئرپورٹ پر ترہ کی کا طیّارہ مقرّرہ وقت پر نہ اُتر سکا بلکہ رَن وے کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر اُوپر اُٹھ گیا۔ اور خاصی دیر تک فضا میں منڈلاتا رہا، کشیدگی کی اس فضا میں امین اور ترہ کی نے استقبالی رسوم میں حصّہ لیا۔ اس کے بعد ترہ کی صدارتی محل کی طرف روانہ ہُوا جہاں امین نے اس کی قبر کُھدوا رکھی تھی۔

ہوانا سے واپسی کے بعد کسی نے ترہ کی کو زندہ نہیں دیکھا۔ اخبارات میں اس کی بعض پرانی تصاویر چھپیں۔ پریس کانفرنسوں اور چند ایسی تقاریر کے مضامین شائع کیے گئے جو اس نے کبھی نہ کی تھیں۔ ترہ کی صدارتی محل میں نظر بند تھا اور امین اس کی موت کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ رُوسی سفیر اور مشیر اپنی مرضی کا نظام چلتا دیکھ کر مطمئن تھے۔ انہیں یہ جاننے کی ضرورت محسوس نہ ہُوئی کہ ان کا وفادار ترہ کی کس حال میں ہے؟ جس رات امین نے ترہ کی کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کیا، رُوسی سفیر پوزانوف صدارتی محل میں موجُود تھا۔ امین نے اس کی موجودگی میں محل کے اندر فوجی بغاوت کا مصنوعی کھیل کھیلا۔ اس "بغاوت" میں ترہ کی اور اس کے محافظوں کے ساتھ ساتھ امین کے گروپ کے کئی افراد بھی مارے گئے۔ مرنے والوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے امین کے حکم پر یہ ڈرامہ تیّار کیا تھا۔

اس کے فوراً بعد ریڈیو سے اعلان کیا گیا تھا کہ نُور محمّد ترہ کی بیماری کی وجہ سے اپنی تمام مصروفیات سے سبکدوش ہو گئے ہیں اور ان کے بجائے انقلابی کونسل اور سنٹرل کمیٹی نے امین کو صدر، وزیرِ اعظم اور پارٹی کا جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا ہے۔ اس اعلان سے رُوسی ششدر رہ گئے۔ یہ سب کچھ ان کے پروگرام کے بالکل برعکس تھا۔ ان کے مُرغِ دست آموز، کارمل کو ایک بار پھر اقتدار سے دور کر دیا گیا تھا۔ اور

وہ اپنے دُوسرے وفادار ایجنٹ ترہ کی سے محروم ہو چکے تھے۔

رُوسیوں نے بہرحال اس تلخ حقیقت کو قبول کر لیا۔ رُوسی سفیر اور فوجی مشیروں نے امین سے کئی ملاقاتیں کیں۔ اس کے بعد ان کے مشورے سے ریڈیو کابل نے اعلان کیا:

"نُور محمد ترہ کی طویل علالت کے بعد مر گئے ہیں اور انہیں ان کے آبائی گاؤں میں دفن کر دیا گیا ہے۔"

دُوسرے اعلان میں کہا گیا کہ دشمنوں کی سازش سے کچھ انقلابی شہید ہو گئے ہیں۔ اس کے معاً بعد ترہ کی کے قریبی ساتھیوں اسد اللہ سروری، اسلم وطن جار، سید محمد گلاب زوئی اور شیر جان مزدوریار نے رُوسی سفارت خانے میں پناہ لے لی۔ خلق و پرچم کے درمیان اختلافات کے بعد اب خلق پارٹی بھی دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ رُوسی سفیر امین سے ناراض تھا۔ کریملن کے حکام نے کہنے کو تو امین کی انتظامیہ کو تسلیم کر لیا اور اُس سے اپنی دوستی کا رسمی اعلان بھی کر دیا تھا۔ لیکن رُوسی کسی صُورت میں بھی امین کو پسند نہ کر سکتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ کمیونزم کا حامی ہے اور رُوسی ایجنٹ کہلانے میں فخر محسوس کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ خود پسند ہے اور حالات سے نمٹنے کے لیے اپنی رائے بھی رکھتا ہے۔ دُوسرے اس نے ترہ کی کو جس طرح ختم کیا اور کارمل کو اقتدار تک پہنچانے کی رُوسی کوشش ناکام بنائی، وہ اس کو بھی کسی طرح معاف کرنے کو تیار نہ تھے۔

امین کا دَور

امین نے اپنے پیش رَو کی پالیسیوں کو ترک نہیں کیا؛ البتہ بے گناہ لوگوں پر جورُ ستم کے شکنجے مزید سخت کر دیے۔ بستیاں بمباری سے تباہ ہوتی رہیں، جیل خانے قیدیوں سے بھرتے رہے، تعذیب خانے اور قتل گاہوں میں مظلوموں کی آہیں اور کراہیں گونجی

رہیں۔ ملک بھر میں سرکاری ادارے رُوس دوستی کے راگ الاپتے رہے۔ اِدھر رُوسی فوجی مشیروں کے اختیارات بڑھتے گئے، اُدھر مجاہدین کے گوریلا دستے بپھرتے ہوئے طوفان میں ڈھلتے رہے۔ امین نے بیرونِ ملک جانے والوں کو روکنے کے لیے پاسپورٹ پر پابندی عائد کر دی، لیکن مہاجرین ان پابندیوں کو خاطر میں لائے بغیر ملک کی سرحدیں پار کرتے رہے۔

ابھی ترہ کی کی تدفین کو زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ امین کی ساری مشینری اُس کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہو گئی۔ وہی امین جسے کبھی "استادِ بزرگ" اور "بابائے انقلاب" کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا، اب سامراج کا ایجنٹ ٹھہرایا جانے لگا۔ دُوسری طرف ترہ کی سے تعلق رکھنے والے سینکڑوں افراد گرفتار کر لیے گئے۔

جُوں جُوں امین نے جبر و استبداد کی آگ تیز کی، فوج کے چھوٹے چھوٹے یونٹ بغاوت کر کے مجاہدین سے ملنے لگے۔ مجاہدین کی قوّت ناقابلِ تسخیر ہو گئی، تو رُوس کے اشارے پر امین کی انتظامیہ نے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ سرکاری اہل کار اور رُوسی ایجنٹ دیہاتی بستیوں میں گھروں، سکولوں اور مساجد کو آگ لگاتے اور پھر ملک بھر میں ان کے ڈھنڈورچی یہ شور مچاتے کہ مجاہدین نے فلاں مسجد اور فلاں اسکول کو جلا دیا اور فلاں بستی کو لُوٹ لیا ہے۔ جو لوگ اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے اُن کے دلوں میں مجاہدین کی محبت کم ہونے کے بجائے اور گہری ہوتی چلی گئی۔ اور وہ رُوس اور اُس کے زرخرید ایجنٹوں پر لعنت بھیجنے لگے۔ پُورے ملک میں ایک بھی مسلمان ایسا نہ تھا جو اس جھوٹ پر یقین کر سکتا۔ جو لوگ صرف عقیدے اور ایمان کی خاطر گھر بار اور مال و دولت کو لات مار کر غیر ملکوں میں بھٹکتے پھر رہے تھے، جو اپنے پیاروں اور چاہنے والوں کو خدا کی راہ میں قربان کر رہے تھے، وہ کسی کا گھر کیسے اُجاڑ سکتے تھے؟ وہ اپنے مراکزِ ایمان اور خُدا کے گھروں کو کس طرح مسمار کر سکتے تھے؟ مگر رُوسیوں کے

ہونہار شاگردوں نے جھوٹ کے قلعے تعمیر کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

رُوسی سفیر کی تبدیلی

کریملن کے حکمران کابل میں اپنے سفیر پوزانوف سے ناراض تھے کہ اس نے بروقت ماسکو کو امین کے منصوبوں سے مطلع نہیں کیا۔ ادھر امین بھی رُوسی سفیر سے ناخوش تھا۔ اس نے جیسے ہی رُوس سے سفیر کی واپسی کی درخواست کی، اس پر فوراً عمل درآمد ہوگیا۔ پوزانوف کی جگہ ایک معروف ڈپلومیٹ فکرت جانیوچ تابیوف (F.A. TABEEV) نے لی۔ پُرانا سفیر ماسکو پہنچا۔ نہیں معلوم، وہاں اُس پر کیا بیتی۔

درخت کاٹنے کی مہم

نئے سفیر نے نئے عزائم کے ساتھ کام شروع کیا۔ جلد ہی وزارتی سطح پہ وفود کی آمدو رفت شروع ہوگئی۔ امین کا پتہ کاٹنے کا فیصلہ صادر ہوچکا تھا۔ آنے والے رُوسی مشیروں نے امین کو کئی مشورے دیے۔ اسے کہا گیا کہ وہ اپنی موجودہ رہائش گاہ کو قومی عجائب گھر بنادے اور خُود دارالامان میں تپہ تاج بیگ والے محل میں منتقل ہو جائے۔ امین نے اس مشورے یا حکم کے مطابق اپنی رہائش گاہ کو میوزیم میں تبدیل کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی رُوسی سفیروں نے شمال میں رُوس جانے والے شاہراہ پہ دو طرفہ گھنے جنگلوں کو کاٹنے کا مشورہ دیا۔ اس کی وجہ بظاہر یہ بتائی گئی کہ مجاہدین کی کارروائیوں سے کابل آنے والی خشک لکڑی کم ہوگئی ہے۔ آنے والی سردیوں میں لوگوں کو ایندھن کی قلت سے بچانے کے لیے یہ اقدام ضروری ہے۔ اس حکم پر فی الفور عمل درآمد ہُوا۔ کابل کے شمال میں شاہراہ سالنگ پر لاکھوں خوبصورت درخت اور باغات کاٹ دیے گئے۔ شجر کُشی کی اس مہم کی زد میں کابل شہر کے بعض اہم تفریحی مقامات بھی آئے۔ امین کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کل کیا پیش آنے

والا ہے، بس وہ آنکھیں بند کیے روسی مشیروں کے احکام پر چل رہا تھا، حقیقت یہ تھی کہ روسیوں کو کابل کے شہریوں کے سردی سے ٹھٹھر کر مرجانے کا غم نہ تھا، بلکہ وہ اپنے ٹینکوں اور بھاری گاڑیوں کو بلا روک ٹوک کابل پہنچانا چاہتے تھے۔

قیمتی نوادر کی لوٹ مار

کابل میوزیم کی تبدیلی سے بھی روسیوں نے فائدہ اٹھایا۔ اشیاء نہایت تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کی گئیں۔ نئی جگہ پر قیمتی نوادر ڈھیروں کی شکل میں ڈال دیے گئے۔ بعض قیمتی چیزوں کو ماسکو پہنچا دیا گیا اور بعض منتقلی کے دوران ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں روسی مشیروں نے کریملن کے حکم کے مطابق وزیراعظم کی رہائش گاہ، وزارتِ خارجہ کے دفاتر اور دوسری اہم وزارتوں سے اہم اور تاریخی نوعیت کی مسلیں ماسکو بھجوا دیں۔ ان میں سے بعض دستاویزات میں روس اور افغانستان کے درمیان تعلقات اور معاہدوں کا بیش قیمت ریکارڈ بھی تھا۔ اس موقعے پر روسیوں نے بعض انتہائی ضروری مسلوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ اس طرح بہت سے ایسے احکامات بھی جل گئے جن سے اس بات کی شہادت ملتی تھی کہ افغانستان کے دور دراز علاقوں پر بمباری براہِ راست روسی فوجی مشیروں کے حکم پر ہوتی تھی اور بہت سے لوگوں کی گرفتاریوں اور سزاؤں کا فیصلہ بھی وہی کرتے تھے۔ اس مہم کے ذریعے روسی امین کے دور تک افغانستان میں اپنی موجودگی کے نشانات مٹانے میں کامیاب ہو گئے۔

امین کا عبرتناک انجام

امین نئے محل میں منتقل ہو گیا جو اس کی آخری آرام گاہ ثابت ہوا۔ روسیوں نے اس کی رہائش گاہ کے اردگرد کی عمارتیں خالی کرا دیں۔ اسے بتایا گیا کہ مجاہدین اس کی جان کے لاگو ہو رہے ہیں، اس لیے اس کی حفاظت کے انتظامات سخت کر دیے گئے

ہیں ۔ ساتھ ہی مجاہدین کی سرگرمیوں میں شدت آنے کی خبریں عام کی گئیں ۔ امین کو ہر روز یہ خبر سُنا کے خوف زدہ کیا جاتا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے ۔ نئے محل کو چاروں طرف سے رُوسیوں نے گھیر رکھا تھا اور وہ عملاً نظر بندی کے دن گزار رہا تھا ۔ ماسکو کی عدالت سے اس کی زندگی کا فیصلہ ہو چکا تھا اور اب اسے منطقی انجام تک پہنچانے کی رسمی کارروائی باقی تھی ۔ آخری رات ایک رُوسی وزیر اور دو نائب وزیر اعظم کابل میں موجود تھے ۔ یہ سب امین کی زندگی کے درپے تھے ، مگر اسے ایک بے بس کٹھ پتلی کی طرح زبان کھولنے کا یارا نہ تھا ۔ وہ بہت خوفزدہ تھا ۔ اپنی زندگی کے آخری دن اس نے کودکستان کے بچّوں سے ملاقات کی ۔ ان کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے کہا :

”تم اس ملک کی نئی نسل ہو ۔ آئندہ تمہی کو یہ ملک سنبھالنا ہے اور اس میں اشتراکی نظام قائم کرنا ہے ۔“

اسی رات رُوسی وزیر امین سے ملنے آیا ۔ اُس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہُوئی تھی ۔ وزیر نے اسے تسلّی دلائی اور بتایا کہ مجاہدین کے حملوں کے خطرے کے پیشِ نظر فوجیوں نے اس کی رہائش گاہ کا محاصرہ کر رکھّا ہے ۔ اور باہر سے کسی شخص کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہے ۔ امین اندھا نہ تھا جو یہ بھی نہ دیکھ سکتا کہ ٹیلی فون کے تار کیوں کاٹ دیئے گئے ہیں ۔ رُوسی وزیر امین کے ساتھ ہی رہا ، تاکہ خطرے کے وقت وہ اسے ”بچا“ سکے ۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ رُوسی طیّارے آزمائشی پروازیں کر رہے ہیں ، تاکہ خطرے کے وقت صُورتِ حال سے نمٹا جا سکے ۔ حالات امین کے بس میں نہ تھے ، آج وہ اپنی مرضی سے خودکشی بھی نہ کر سکتا تھا ، پھر اُس نے افغان فوجیوں کو بندوقیں تانے اپنی طرف بڑھتے دیکھا ۔ وہ ایسا اندھا بھی تو نہ تھا کہ محافظوں اور قاتلوں میں فرق نہ کر سکتا ۔

۲۵ / دسمبر ۱۹۷۹ء کو کابل کی فضا کا سنّاٹا رُوسی طیّاروں کی گونج سے ٹوٹا ۔ فضا میں طیّاروں کی آمد کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع تھا اور کابل کے شہری حیران تھے ۔

ہر شخص گھبرایا ہُوا دُوسرے سے پُوچھ رہا تھا۔ کیا ہو رہا ہے، کیا ہونے والا ہے؟ مگر کسی کے پاس ان سوالوں کا جواب نہ تھا۔ ایک طرف دیو ہیکل ٹرانسپورٹ طیّارے ہزاروں رُوسی فوجیوں کو اُتار رہے تھے تو دوسری طرف رُوسی سرحد سے ہزاروں ٹینک دریائے آمو (یعنی جیحوں) عبور کر کے افغانستان کی سرزمین میں داخل ہونے لگے۔

تاریک رات

۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کی رات جب کابل پر گہرے اندھیرے سایہ ڈال چکے تھے، اچانک پورا شہر ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سے لرزنے لگا۔ اس کے بعد توپوں نے گولے اُگلنے شروع کیے۔ اگلے دو روز تک یہ آوازیں شدت سے سُنائی دیتی رہیں۔ امین کے حامی حلقیوں نے اس تبدیلی کو کھلے دل سے قبول نہ کیا تھا۔ مہتاب قلعہ، قرغہ، ریڈیو کابل، قلعہ بالاحصار اور امین کے محل کے گردونواح میں خونریز جنگ ہوئی۔ مگر امین کے حامیوں کی تمام جدّوجہد اکارت گئی۔ وہ رُوسی ٹینکوں، توپوں اور طیّاروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی کئی روز تک مختلف صُوبوں میں فوج کے بعض دستوں نے مزاحمت جاری رکھی جو بتدریج دم توڑتی چلی گئی۔

رُوسی امین کو جان سے مارنے کے حق میں نہ تھے۔ وہ اسے کسی دوسرے وقت کے لیے زندہ رکھنا چاہتے تھے۔ رُوسی وزیر نے اسی مقصد کے لیے اس کے محل میں رات گزاری۔ لیکن ان کا یہ منصوبہ ناکام رہا۔ پرچم پارٹی کے ناراض فوجی افسروں نے اسے گولی

کا نشانہ بنانے میں ذرا بھی تاخیر نہ کی۔

ابھی ریڈیو کابل سے معمول کے پروگرام نشر ہو رہے تھے کہ تاشقند ریڈیو کی خصوصی نشریات میں ببرک کارمل کی تقریر بار بار نشر کی جانے لگی۔ اس تقریر میں کارمل افغانوں کو یہ "نوید" سُنا رہا تھا:

"فسطائی آمر کی حکومت ختم کر دی گئی ہے، عوام کو مبارک ہو"

ریڈیو کابل پر رُوسیوں کا قبضہ رات ۹ بجے کے بعد ہُوا۔ اس کے ساتھ ہی پروگرام تبدیل ہو گئے۔ پہلے ترانے نشر کیے گئے اور رات ساڑھے گیارہ بجے ببرک کارمل کی تقریر اور نئے احکامات نشر ہُوئے۔

عام لوگوں نے رات ہی کو سُن لیا تھا کہ امین مارا گیا ہے، اس لیے وہ یہ اطمینان لے کر سوئے تھے کہ ایک جلّاد ختم ہو گیا۔ مگر جب وہ دُوسری صبح بیدار ہُوئے تو انہوں نے شہر کی سڑکوں پر رُوسی ٹینکوں کو گشت کرتے دیکھا۔ رُوسی ساخت کے مگ طیّارے اور ہیلی کاپٹر نیچی پرواز کرتے ہُوئے گزر رہے تھے۔ کابل کے شہری سکتے میں آ گئے۔

رُوسی فوج شاید اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ افغان عوام بھی چیکوسلواکیہ اور ہنگری کے لوگوں کی طرح اس کے ٹینکوں پر پھُولوں کی پتیاں نچھاور کریں گے اور اس کی آمد پہ شادیانے بجائیں گے۔ مگر اس کے برعکس ہزاروں ناراض لوگ رُوسیوں کے ٹینکوں اور گاڑیوں پر تھوک رہے تھے اور رُوسیوں پر لعنت بھیجی جا رہی تھی۔ اسی روز دوپہر سے پہلے رُوسی فوج کو شہر سے باہر نکال کر اہم پوزیشنوں پر متعین کر دیا گیا کہ مبادا عوام اور رُوسی فوجوں میں تصادم ہو جائے۔

امین کی کابینہ کے اکثر لوگ جیلوں میں بند کر دیے گئے اور پُل چرخی جیل سے سینکڑوں پرچمیوں کو رہا کر دیا گیا۔ کارمل کے اقتدار کا جشن اس طرح منایا گیا کہ پُل چرخی کے احاطے کے اندر سینکڑوں مخالفین کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ پرچم پارٹی کے کارکنوں کو

رُوسی ساخت کی آٹو میٹک رائفلیں دے کر سڑکوں پر گشت کرنے کا کام سونپ دیا گیا۔ ملک بھر میں جہاں جہاں رُوس کی مُسلّح جارحیت کی خبر پہنچی، لوگ غیظ و غضب میں بھرے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ فوج کے کئی یُونٹ اپنے اسلحے سمیت مجاہدین سے آملے۔

کارمل کا تاریک دَور

نیا رُوسی ایجنٹ ایک لاکھ سے زیادہ فوج، سینکڑوں طیّارے اور ہزاروں ٹینک لے کر کابل پہنچا۔ اس کی آمد افغانستان پر رُوسی قبضے کا رسمی اعلان تھی۔ تیسرا برس ختم ہونے کو ہے اور رُوسی شاطروں کا یہ مہرہ ابھی تک کٹھ پُتلی انتظامیہ کا سربراہ ہے، مگر اس کی حیثیت انگوٹھا لگانے والے سے زیادہ نہیں۔ سیاہ سفید کے مالک رُوسی فوجی مشیر اور افسر ہیں۔ رُوسیوں نے ببرک کارمل کو نفرت کی علامت تو بنا دیا، مگر اسے ابتدا ہی سے بے اختیار رکھا۔ رُوسیوں نے اسے جس مقصد کے لیے مسندِ اقتدار تک پہنچایا تھا وہ ابھی پُورا نہیں ہُوا۔ کارمل مجاہدین کو دبانے اور عوام کی حمایت حاصل کرنے میں اپنے پیشروؤں سے زیادہ ناکام ثابت ہُوا ہے۔ اس کے آنے کے بعد سے کمیونسٹ نئی ناکامیوں سے دوچار ہُوئے ہیں۔ رُوسیوں کے قدموں کے نیچے سے کچھ اور زمین سرک گئی ہے۔ اس وقت مقبوضہ افغانستان کی عملی صُورتِ حال یہ ہے کہ ملک کا ۸۵ فیصد سے زیادہ علاقہ مجاہدین کے کنٹرول میں ہے اور بیرونی حملہ آور ملک کے چند شہروں اور شاہراہوں پر قابض ہیں۔ کارمل کے سیکرٹری اور باڈی گارڈ تک اس کے احکام کی پروا نہیں کرتے اور رُوسی فوجی افسروں سے ہدایات حاصل کرتے ہیں۔

افغان فوج کا وجُود ختم ہو چکا ہے۔ نصف سے زیادہ فوجی مجاہدین کے ساتھ مل کر رُوسیوں کے خلاف مصروفِ جہاد ہیں، کچھ لڑائیوں میں مارے گئے ہیں جو باقی ہیں اُن کا ایک حصّہ جیل خانوں میں ہے۔ ان کو مختلف اوقات میں بغاوت میں حصّہ لینے کے الزام میں

گرفتار کیا گیا۔ اب جن لوگوں کو "افغان فوج" کہا جاتا ہے، وہ دُنیا کو دھوکا دینے کے لیے بیگار میں پکڑے ہُوئے لوگ ہیں جن کو رُوسی صرف نمائشی مقاصد کے لیے بھرتی کر رہے ہیں۔ اُنہیں معمُولی سا اسلحہ دیا گیا ہے۔ اس اسلحے سے بھی انہیں خاص خاص موقعوں پر ہی لیس کیا جاتا ہے۔ اور جب وہ ضرورت پُوری ہو جاتی ہے تو نہتا کر کے اِنہیں پھر فوجی کیمپوں میں بھیج دیا جاتا ہے۔ محاذوں پر رُوسی فوجی خود جاتے ہیں۔ کارمل انتظامیہ نے پہلے اٹھارہ برس سے زیادہ عمر کے نوجوانوں کی جبری بھرتی کا قانون نافذ کیا۔ اس کے بعد ۳۵ سال سے زیادہ عمر کے لوگوں کو فوجی مقاصد کے لیے پکڑا جانے لگا، مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام کارآمد لوگ شہروں سے نکل کر پہاڑوں میں جا بسے یا ہجرت کر کے پاکستان اور ایران چلے گئے۔

اگر یہ کہا جائے کہ گزشتہ تین برسوں میں افغانستان کی نصف آبادی یا تو ہجرت کر چکی ہے یا جنگ کا ایندھن بن چکی ہے، تو مبالغہ نہ ہوگا۔ تیس لاکھ افراد ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ ان میں سے پچیس لاکھ کے قریب پاکستان میں ہیں، پانچ لاکھ سے زیادہ ایران اور دُوسرے ملکوں میں چلے گئے ہیں۔ ہجرت کا سلسلہ جاری ہے اور جب تک رُوسی جارحیت ختم نہیں ہوتی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

تعلیمی اداروں میں بے چینی

ملک میں بڑھتی ہُوئی بے چینی کے اثرات تعلیمی اداروں تک بھی پہنچے ہیں۔ ملک کے اسی فیصد دیہاتی علاقوں میں تو تعلیم و تدریس کا سلسلہ تقریباً موقوف ہو چکا ہے۔ کیونکہ پڑھنے اور پڑھانے والے دین و وطن کی خاطر گھر بار چھوڑ چکے ہیں، لیکن کابل اور چند بڑے شہروں میں جہاں کچھ تعلیمی اداروں میں طلبہ ابھی تک آتے جاتے ہیں، وہاں بھی تعلیم سے زیادہ مظاہرے اور ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ طلبہ نے آزادی کی جنگ میں جتنی عظیم قربانیاں پیش کی ہیں تاریخ اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ افغانستان

کی درس گاہوں کے ہزاروں ہونہار سپوتوں نے اپنے دین کی حرمت اور وطن کی آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کی ہیں، ہزاروں اساتذ بھی جیل خانوں میں اذیتیں سہنے کے بعد شہید ہو گئے۔ ملک میں علم کے ہزاروں سوتوں سے لہو اُبل رہا ہے۔

جہادِ آزادی میں طلبہ سے بھی زیادہ طالبات نے جرأت و ایثار کی مثالیں پیش کیں۔ سکولوں کی کم سن بچیوں نے لا الٰہ الا اللہ کا پرچم اٹھا کر مظاہروں اور جلوسوں میں حصہ لیا، اللہ کے نام کی عظمت کی خاطر گولیاں کھائیں اور مسکراتے ہوئے شہادت قبول کر لی۔ سینکڑوں پاک نہاد بچیوں کو جانوں کے ساتھ ناموس کی قربانی کرنی پڑی۔ بہت سی ایسی بھی تھیں جن کی زندگی یا موت کا کسی کو پتہ نہ چل سکا۔

کابل شہر کے ایک حصے میں جسے مکروریان کہا جاتا ہے، کنڈرگارٹن کے معصوم بچوں نے کھانے پینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے اپنے بستے اور تختیاں پھینک دیں اور "روس مردہ باد" اور "کارمل مردہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے سکول سے باہر نکل آئے۔ اُنہوں نے رُوس کا بنا ہُوا دُودھ پینے سے انکار کر دیا۔ اس طرح غیور قوم کے غیور بچوں نے بھی جہاد میں اپنا کردار ادا کیا۔ کارمل انتظامیہ کے بہادر اہل کاروں نے ان معصوموں کو گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ ان کے ساتھ ہی ان کے والدین کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ جب ان بچوں سے پُوچھا گیا کہ انہوں نے دُودھ پینے سے انکار کیوں کیا تو معصوم بچوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا:

"ہم دُودھ اس وقت پئیں گے جب رُوس ہمارے ملک سے نکل جائے گا"

اوچھے ہتھکنڈے

عام لوگوں کو متأثر کرنے کے لیے کارمل نے کئی مصنوعی طریقے استعمال کیے۔ نمائشی اجتماعات بلائے اور بعض قبائلی نمائندوں کو مختلف ترغیبات کے ذریعے ان

میں شریک کیا گیا۔ یہاں اس نے شعلہ بیانی سے دلوں کو موہنے کی بہت کوشش کی، مگر وہ کسی شخص کو اپنے دام میں پھنسا نہ سکا۔ ذوقِ تقریر پُورا کرنے کے لیے دُوسرے شہروں سے تجارت کے سلسلے میں آئے ہُوئے لوگوں کو کابل میں جمع کر لیتا اور ان کے سامنے دُھواں دھار تقریریں کرتا۔ ریڈیو کابل ایسے اجتماعات کو عوامی اجتماعات قرار دیتا ہے۔ اس طرح کارمل بزعمِ خود رُوس کو یقین دلانا چاہتا ہے کہ کم از کم قبائلی نمائندے اور تاجر طبقے کے لوگ تو اس کے ساتھ ہیں، مگر ان ڈھکوسلوں سے نہ تو رُوسی بہل سکے ہیں نہ لوگ۔ اتنے اوچھے ہتھکنڈوں کے بعد بھی صورتِ حال یہ ہے کہ لوگ کارمل سے ترہ کی اور امین کی نسبت زیادہ نفرت کرتے ہیں۔

کارمل نے آتے ہی اعلان کیا تھا کہ گزشتہ دور کے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ محض دکھاوے کے لیے محدود تعداد میں لوگوں کو رہا کیا گیا، لیکن اس سے زیادہ کو گرفتار کر لیا۔ پُل چرخی جیل میں امین کے دَور میں تیس چالیس ہزار سیاسی قیدی موجُود تھے، مگر کارمل نے صرف چھ ہزار رہا کیے۔ اس کے علاوہ ملک کی بیسیوں دُوسری جیلوں میں بھی لاکھوں قیدی موجُود تھے، مگر ان میں سے گنتی کے چند سو کو چھوڑا گیا۔ باقی لوگ کہاں گئے، کوئی بتانے والا نہیں۔ رہائی کے اس ڈرامے نے تو ان لوگوں کے زخم ہرے کر دیے جو اپنے عزیزوں کی نجات کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ ملک کے ہزاروں علماء، دانش وَروں، شاعروں، ادیبوں، اساتذہ، ڈاکٹروں، انجینئروں اور سیاستدانوں کے بارے میں آج بھی کچھ پتہ نہیں کہ آسمان کھا گیا یا زمین نگل گئی۔ جیلوں سے قیدیوں کی رہائی کا سلسلہ شروع ہو کر ختم ہو گیا، لیکن ماؤں کی آنکھیں اپنے بیٹوں کے لیے آج بھی چشم براہ ہیں، لاکھوں بچّوں کو اپنے شفیق باپوں کی آج بھی تلاش ہے۔

زرخرید مولوی کانفرنس

اسی دَوران کارمل نے ایک اور چال چلی۔ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے عُلمار کی ملک گیر کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ اس اعلان سے بڑا جھُوٹ اور کیا ہو سکتا تھا۔ عُلماء کی اکثریت شہید ہو چکی تھی، جو باقی تھے وہ مجاہدین کے دستوں کی قیادت کر رہے تھے یا ہجرت کر کے ملک سے جا چکے تھے۔ افغانستان میں کسی عالمِ دین کا وجُود نہ تھا؛ چنانچہ دھڑا دھڑ ایسے مولوی بھرتی کیے گئے جن کے چہروں پر داڑھی تھی اور جو کمیونزم کی تعلیمات کو قرآن پر منطبق کرنے کے لیے تیّار تھے۔ ایسے لوگوں سے لینن اور کارمل کے حق میں تقاریر کرائی گئیں، مگر یہ ناپاک کوشش بھی ناکام رہی۔ کسی شخص کو اس بات کا یقین نہ آیا کہ کوئی عالمِ دین رُوسیوں کا حامی بھی ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد ملک بھر میں اخبارات وجرائد کے ذریعے مضامین کا ایک سلسلہ چلایا گیا۔ مضمون نگاروں نے بڑے معاوضوں کے بدلے ایسے مضامین لکھے جن کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ رُوس وسط ایشیا کے جن علاقوں پر قابض ہُوا ہے وہاں مسلمانوں کے عقائد کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اُن کی عبادات میں کسی قسم کی مداخلت نہیں ہوتی۔ یہ مہم بھی رُوسیوں کے کام نہ آئی۔ لوگ پُوچھتے تھے کہ اگر یہ بات سچ ہے تو آج سے پہلے رُوسیوں کو اس کا ثبوت دینے کی ضرورت کیوں محسوس نہ ہُوئی، خدمتِ اسلام کا یہ دعویٰ پہلے تو کبھی نہ کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں سے زیادہ اس حقیقت کو کوئی نہیں جانتا کہ وسطِ ایشیا کے مسلمانوں کو رُوسیوں نے اس طرح مٹایا ہے کہ ان کا تشخص ہی ختم کر دیا ہے۔ مساجد بند کر دیں، علماء کو چُن چُن کر ٹھکانے لگا دیا اور قرآن وحدیث کی تعلیم وتدریس ممنوع ٹھہرا دی۔ حال ہی میں بعض رُوسی مقبوضہ شہروں میں مساجد کی صفائی اور ان میں اماموں کا جو تقرّر کیا گیا ہے، اس کا مقصد

بھی دنیا کو گمراہ کرنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس سے بیرونی دُنیا سے آنے والے مسلم وفود کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دیکھو ہم مسلمانوں کو کس طرح مذہبی آزادی دے رہے ہیں۔ افغانستان میں کمیونسٹ مضمون نگاروں نے یہی بات لہجے بدل بدل کر کہی، مگر لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب دینے کے بجائے ان کے اضطراب میں اضافہ کر دیا۔

بپھرا ہُوا طوفان

۲۲ر اور ۲۳ر فروری ۱۹۸۰ء کو سارے ملک میں مردوں، عورتوں اور بچّوں نے دن کے وقت جلوس نکالے اور راتوں کو اذانیں دیں۔ مظاہرین نے کارمل انتظامیہ کے خلاف شدید غم و غصّے کا اظہار کیا۔ کابل کے بازاروں میں مردوں کے ساتھ ساتھ معصوم بچے، عورتیں "مرگ بر رُوس" اور "مرگ بر کارمل" کے نعرے لگا رہے تھے۔ رُوسی فوجیوں نے جلوسوں پر بے رحمی سے گولیاں چلائیں۔ سینکڑوں بے گناہ لوگ شہید ہوگئے۔ اور بہت سے لوگوں کو پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان قیدیوں میں سے بہت تھوڑے لوگ زندہ و سلامت اپنے گھروں تک واپس پہنچے۔ باقی کے بارے میں آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکا کہ کہاں ہیں۔ بہرحال نہتّے عوام نے رُوسیوں کے ٹینکوں کے سامنے سینہ تان کر بتا دیا کہ وہ ان کی غلامی قبول کرنے کو تیّار نہیں ہیں۔

مجاہدینِ آزادی اپنے وطن پر ٹوٹتی ہُوئی قیامت کو دیکھ رہے تھے۔ وہ مضطرب تھے، بے کل تھے اور یہی بے کلی انہیں ہتھیار اُٹھانے اور میدان میں نکلنے پر آمادہ کر رہی تھی۔ رُوسیوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ کم از کم بپھرے ہُوئے طوفان کو شہروں کی طرف بڑھنے سے روک دیا جائے، مگر وہ اس میں بھی ناکام رہے۔ مجاہدین نے کابل شہر کے اندر داخل ہو کر خیر خانہ مینہ میں رُوسی فوجی چھاؤنی پر حملہ کیا اور بڑی تعداد میں ٹینک،

بکتر بند گاڑیاں اور دوسرا فوجی ساز و سامان تباہ کر دیا۔ کابل کے قریب بُتِ خاک کے مقام پر اسلحہ کا بہت بڑا گودام نذرِ آتش کر دیا۔ بگرام ایئر پورٹ پر روسیوں کے سب سے بڑے اسلحہ خانے کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور اربوں روبل کا قیمتی جنگی سامان جس میں توپیں اور راکٹ تک شامل تھے، تباہ کر دیا۔ اس اسلحہ خانے سے دو روز تک دھماکوں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

پغمان کے قریب رُوسی فوج کے ہزاروں چھاتہ برداروں کو زمین پر اُترتے ہی ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ رُوس کے فوجی قافلوں پر مختلف گروپوں کی طرف سے ہزاروں کامیاب شبخون مارے گئے۔ ان حملوں نے رُوسی فوجی حکمتِ عملی کا ہر داؤ ناکارہ کر دیا۔

مداخلت کاروں کے خلاف عوامی نفرت کا یہ حال ہے کہ جب وہ کسی رُوسی کو قتل کرتے ہیں تو اس کے گلے میں مختلف فقروں اور نعروں والے طوق ڈالنا نہیں بھولتے۔ کسی کی لاش کو یُوں سبق دیا جاتا ہے:

"یہ سمرقند و بخارا نہیں، افغانستان ہے"

کسی جگہ یوں تنبیہہ کی جاتی:

"روسیو! ہمارے ملک سے نکل جاؤ، ہم قیامت تک لینن ازم قبول نہیں کریں گے"

ایک رُوسی کی لاش کے گلے میں اس مضمون کی تختی ڈالی گئی:

"فتح یا شہادت" ہمارا آئین ہے، تمہارا یہی حال ہوتا رہے گا۔ جب تک تم ہماری سرزمین پر موجود رہو گے"

رُوسی فوجیوں کے علاوہ سینکڑوں روسی فوجی مشیر بھی مارے گئے ہیں۔ ہرات شہر کے بہادر عوام نے صرف ایک ہفتے میں ایک سو سے زیادہ روسی مشیروں کو قتل کیا۔

اس کے بعد ان کی لاشوں کو سڑکوں پر گھسیٹا گیا۔ خود کابل شہر کے اندر ایک رُوسی جرنیل کو ہلاک کر دیا گیا۔

رُوس نواز افغانوں کا حال رُوسیوں سے بھی بدتر تھا۔ مجاہدین نے ملک کے طُول و عرض میں ایسے لوگوں کی فہرستیں تیّار کر رکھی ہیں جو کسی طرح بھی رُوسیوں کے ہمدرد اور ہمنوا ہیں۔ ایسے لوگوں کو کسی رعایت کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ جب مجاہدین کی اسلامی عدالت کسی شخص کے خلاف سزائے موت کا فیصلہ صادر کر دیتی ہے تو اسے سات پردوں سے نکال کر بھی قتل کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کو دوسروں کے لیے عبرت بنانے کے لیے بعض اوقات سرِعام گولی مار دی جاتی ہے۔ مجاہدین کارمل انتظامیہ کے کئی اعلیٰ فوجی اور سول افسروں اور وزیروں کو بھی ٹھکانے لگا چکے ہیں۔

دو سال سے رُوسی فوج مجاہدین کی سرگرمیاں ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکی ہے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ چند بڑے شہروں پر اس کا قبضہ ہے، لیکن اب ہرات، قندہار اور غزنی جیسے شہروں کا اکثر حصّہ بھی مجاہدین کے کنٹرول میں آ چکا ہے۔ جن محدود مقامات پر رُوسی اپنی موجودگی برقرار رکھے ہُوئے ہیں، وہاں بھی ٹینکوں، توپوں اور طیاروں کا شدید پہرا ہے اور مجاہدین چاروں طرف سے اُن کے گرد گھیرا تنگ کر رہے ہیں۔ رات کے وقت ملک کا اکثر حصّہ مجاہدین کے کنٹرول میں ہوتا ہے۔ ان کے زیرِانتظام علاقوں میں اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں لایا جا چکا ہے۔ کئی علاقوں میں اسلامی حُدود کے تحت فیصلے بھی ہو رہے ہیں۔

کابل شہر کو کئی ڈویژن فوج گھیرے میں لیے ہُوئے ہے۔ وہاں گزشتہ چار برس سے مسلسل کرفیو بھی نافذ ہے۔ اس کے باوجُود شہر کے اندر گھُس کر مجاہدین نے رُوسیوں پر بھرپُور حملے کیے ہیں۔ رُوسی سفارت خانے کو نشانہ بنایا ہے اور قلعہ بالا حصار پر فائرنگ کی ہے۔ شہر پر رُوسی قبضہ صرف دن کے وقت نظر آتا ہے جب شہر میں رُوسی فوجی اور ٹینک گشت

کرتے ہیں۔ شام ڈھلتے ہی رُوسی اپنے ٹینکوں میں بیٹھ کر بھاگ نکلتے ہیں اور پرچمی افسر اپنے گھروں کے کواڑ مُقفل کر کے چھپ جاتے ہیں۔ کابل میں ایک سے زیادہ مرتبہ مکمل ہڑتالیں ہو چکی ہیں۔ افغانستان کے کئی شہروں میں ہندو اور سکھ اقلیتیں بھی رُوسیوں کے خلاف شدید ردِ عمل ظاہر کر چکی ہیں۔ انہوں نے بار بار رُوس سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ فی الفور اپنی فوج واپس بلا لے۔

اِنتظامی بُحران

کارمل انتظامیہ کے بہت سے اہم افسر اس کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ آریانہ ایئر لائنز کا سٹاف مُلک چھوڑ کر باہر چلا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے کارمل انتظامیہ کے لیے ہوائی کمپنی کا چلانا مُشکل ہو گیا ہے۔ افغان حاجیوں کی اکثریت مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد سعودی عرب میں پناہ لے لیتی ہے۔ جب سے مجاہدین نے کندز میں پرچم پارٹی کا ساتھ دینے کے جُرم میں قومی ہاکی ٹیم کے کچھ ارکان کو قتل کیا ہے، مُلک میں کھیلوں کی اکثر ٹیمیں جن میں فٹ بال، ریسلنگ اور باسکٹ بال کی ٹیمیں شامل ہیں، مُلک چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔

کئی اہم افغان سفارت کاروں نے کارمل انتظامیہ کے خلاف اعلانِ بغاوت کیا ہے۔ ان میں اقوامِ مُتحدہ میں افغانستان کے نمائندے جناب عبدالحکیم طبیبی بھی ہیں۔ انہوں نے وطن واپس جانے سے انکار کرتے ہُوئے اقوامِ عالم سے اپیل کی کہ وہ افغانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کے تدارک کی کوشش کریں۔ اسی طرح بلغراد میں یونیسکو کی کانفرنس کے دوران افغان نمائندے اختر محمد پکتیاوال نے اپنی تقریر کا رُخ اچانک رُوسی جارحیت کی طرف پھیر دیا۔ انہوں نے رُوسیوں کے مظالم گنواتے ہُوئے دُنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد سے وہ مغربی جرمنی میں پناہ گزین ہیں۔ عبدالرحیم پوپلزئی جو اقوامِ مُتحدہ میں غیر جانبدار ممالک کے اجلاس سے خطاب کرنے گئے

تھے، انہوں نے بھی وطن واپس جانے سے انکار کر دیا۔ اور رُوسی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہُوئے کہا کہ رُوسیوں کے افغانستان میں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ انہوں نے کہا:

"ہماری وزارتِ خارجہ میں ایسی کوئی دستاویز موجُود نہیں جس کے ذریعے رُوسی فوج کی افغانستان میں موجُودگی کا جواز نکلتا ہو۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ رُوس ہمارے ملک پر قبضہ کرنے کے ارادے سے آیا ہے"

یہی باعث ہے کہ اب کارمل انتظامیہ بین الاقوامی کانفرنسوں میں اپنے نمائندے بھیجنے سے بھی ڈرتی ہے۔

کابل کی کٹھ پتلی حکومت ان دنوں جن بحرانوں سے دوچار ہے اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ملک کا نظام چلانے کے اس کے پاس لوگ نہیں رہے ہیں۔ تجربہ کار، صاحبِ علم اور محبِ وطن لوگ جو ملک کو چلانے کی اہلیت رکھتے تھے یا تو ختم کر دیے گئے ہیں یا ملک چھوڑ کر جا چکے ہیں، اس خلا کو پُر کرنے کے لیے رُوسی آگے بڑھ رہے ہیں۔ اب ملک میں اہم عُہدوں پر رُوسی افسر تعینات کیے جا رہے ہیں۔ کابینہ موجُود ہے، لیکن ہر وزیر کا کردار نمائشی ہے۔ اصل اختیارات مختلف محکموں کے رُوسی مشیروں کے پاس ہیں۔ وزیر بھی ان کے احکام کے پابند ہیں۔ کارمل کا حفاظتی دستہ رُوسیوں پر مشتمل ہے۔ صدارتی محل کے باہر نمائش کے طور پر چند افغان کھڑے ہیں، لیکن دروازوں کے اندر رُوسی کھڑے کیے جاتے ہیں۔ کارمل کا باورچی، مُعالج اور اس کو تقریریں لکھ کر دینے والا بھی رُوسی ہیں۔

نصابِ تعلیم کا بڑا حصّہ تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اہم تبدیلی یہ عمل میں لائی گئی ہے کہ اسلامیات اور اسلامی تاریخ کے مضامین کو خارج کر کے ان کی جگہ کمیونزم کی تاریخ اور اُصولوں کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے اکثر اسکول بند ہیں اور جو کھلے

ہیں وہاں طلبہ نہیں ہیں۔

کلیدی اسامیوں پر روسیوں کا تقرر

یوں تو سبھی وزارتوں کا کنٹرول روسیوں کے پاس ہے، لیکن وزارتِ خارجہ تو مکمل طور پر اُن کے تصرّف میں ہے۔ افغان وزیرِ خارجہ شاہ محمد دوست اور اُس کے ساتھیوں کا کام محض اتنا ہے کہ روسی حکام فیصلے کریں اور یہ لوگ ان کو نافذ کریں یا بیرونی ملکوں میں جا کر روسی آقاؤں کی ترجمانی کریں۔ وزارتِ معدنیات کے تمام اعلیٰ افسر روسی ہیں۔ ۱۹۷۹ء میں روسی فوجی مداخلت کے بعد افغانستان کے تمام معدنی وسائل روس کی براہِ راست تحویل میں چلے گئے ہیں۔ اسی لیے اکثر قیمتی دھاتیں روس منتقل کی جا رہی ہیں۔ ملک کی زرعی پیداوار مثلاً روئی، چقندر اور زیتون وغیرہ بھی روس پہنچ رہی ہے۔ یہ سب چیزیں نہایت سستے داموں خریدی جاتی ہیں، لیکن کسی شخص کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہی حال قدرتی گیس کا ہے جسے روس اپنے گزشتہ قرضوں کے عوض مفت میں لے جا رہا ہے۔ پھر یہی گیس یورپی منڈی میں نہایت مہنگے داموں فروخت کی جاتی ہے۔

ملکی معیشت ترہ کی اور امین کے دَور میں بھی تباہی کے کنارے پہنچ چکی تھی۔ اب حالت پہلے سے بدتر ہو چکی ہے۔ بینکوں میں سرمایہ باقی نہیں رہا، زرِمبادلہ کے ذخائر ختم ہو چکے ہیں۔ بیرونی تجارت کا کمزور سا سہارا بھی ٹوٹ رہا ہے۔ غیر ملکی سیاحت سے جو خاصی بڑی آمدنی ہوتی تھی وہ بھی ختم ہو چکی ہے۔ زرعی پیداوار بھی ملکی وسائل میں اضافے کے بجائے روس کے کام آ رہی ہے۔ عوام کو کھیتی باڑی کی نہ تو اجازت ہے اور نہ اُن کے پاس وقت ہے۔ اگر وہ کاشت کاری کریں بھی تو بمباری سے ان کی فصل جلا دی جاتی ہے۔

رُوسی فوج کی واپسی کا ڈرامہ

دسمبر ۱۹۷۹ء میں افغانستان آنے والے رُوسی فوج میں کچھ لوگ وسطِ ایشیائی مقبوضہ مسلم ریاستوں کے بھی تھے۔ ان میں سے بعض فارسی بھی بول سکتے تھے۔ انہیں ساتھ لانے سے روسیوں کا مقصد یہ تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر افغان عوام کو دھوکا دے سکیں گے اور ان کی زبان میں ان کے سامنے تبلیغ کریں گے اور انہیں بتائیں گے کہ رُوسی ان کے ہمدرد ہیں اور وسطِ ایشیا میں اسلام کو انہوں نے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ لیکن یہ چال اُلٹی پڑی۔ جب یہ لوگ اللہ اکبر کے نعرے لگانے والے مجاہدین کے مقابل آئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ان کے سامنے کوئی امریکی یا چینی سپاہی نہیں، نہ کوئی ایرانی ہے اور نہ پاکستانی ہی ہے تو وہ حیران رہ گئے۔ انہیں تو یہ کہہ کر لایا گیا تھا کہ افغان عوام پر بیرونی مداخلت کار فوجیں ظلم ڈھا رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر ان میں سے کئی لوگ مجاہدین کے ساتھ آملے۔ بعض نے لڑنے سے انکار کر دیا اور رُوسیوں کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

اس صورتِ حال سے پریشان ہو کر کریملن کے حکّام کے لیے ان لوگوں کو واپس بلانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ دُنیا کو دکھانے کے لیے مشہور یہ کیا گیا کہ چونکہ افغانستان میں ملک دشمن عناصر کا زور توڑ دیا گیا ہے، اس لیے کچھ فوج واپس بھیجی جا رہی ہے۔ اس موقعے پر یہ بھی کہا گیا کہ اگر ہمیں یہ ضمانت مل جائے کہ بیرونی مداخلت ختم ہو جائے گی، تو ہم باقی فوج کو بھی واپس بلا لیں گے۔ لیکن ایسی کسی ضمانت کے ملنے کا انتظار کیے بغیر ہی روسیوں نے اگلے ہفتے واپس بلائے جانے والے دستوں سے دُوگنی تعداد میں مزید فوج کابل میں اتار دی۔

ناموس کے لٹیرے

افغانستان میں رُوسی فوج کی موجودگی سے اس بات کی تصدیق ہوگئی ہے کہ رُوس کا فوجی دُنیا کا سب سے غیر مہذب اور خونخوار فوجی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اس کی ہوس کاری اور بے حیائی کا مقابلہ بھی دُنیا کی کوئی دُوسری قوم نہیں کر سکتی ۔ جب یہ لوگ اپنے فوجی کیمپوں سے آگے بڑھتے ہیں تو شرافت کے تمام لبادے اتار پھینکتے ہیں ۔ انہوں نے دیہات میں مجاہدین کی تلاش کے بہانے غریب اور نہتے عوام کی عزّت و آبرُو پر بھی حملے کیے ۔ انہوں نے معصوم اور بے گناہ دوشیزاؤں کی آبرو لُوٹنے کے بعد انہیں قتل کر کے پھینک دیا ۔ اس قسم کا ایک دلخراش واقعہ چند ماہ پہلے کابل شہر میں پیش آیا جب رُوسی دو بے گناہ اور معصوم لڑکیوں کو اُٹھا کر لے گئے اور بعد میں اُن کو مُردہ حالت میں پھینک کر چلے گئے ۔ لوگوں نے ان بے گناہوں کے لاشے اُٹھا کر جلوس نکالا ، مگر نہ تو کوئی ان معصوموں کا گناہ بتانے والا تھا اور نہ دادرسی کرنے والا ۔ اس قسم کے سینکڑوں واقعات ملک کے کونے کونے میں پیش آچکے ہیں کہ افغان خواتین رُوسی ہوس کاروں سے بچنے کے لیے دریاؤں میں کُود پڑیں یا تیل چھڑک کر خود کو آگ لگا دی ۔

افغانستان ویت نام نہیں

بعض لوگ افغانستان کی جدوجہد کو ویت نام سے تشبیہ دیتے ہیں ، لیکن یہ درست نہیں ہے ۔ افغان عوام کی جدوجہد کی مثال تاریخ میں موجُود نہیں ہے ۔ ویت نامیوں نے امریکہ کے خلاف گوریلا جنگ کی تربیت رُوسی اور چینی کیمپوں میں حاصل کی تھی ۔ دُنیا کی ان دو بڑی طاقتوں کا اسلحہ اور فنی امداد ان کی پُشت پر تھی ۔ بعض مقامات پر چینی گوریلے ان کے شانہ بشانہ لڑتے رہے ۔ پھر وہ ایک ایسی فوج سے لڑ رہے تھے جو ہزاروں میل

دُور سے بھیجی گئی تھی۔ امریکی فوجیوں کا مورال خود امریکیوں نے تباہ کر رکھا تھا، جو اس جنگ کے حق میں نہ تھے۔ اس کے برعکس افغانستان میں لڑنے والی رُوسی فوج کا اپنے ملک سے براہِ راست رابطہ ہے۔ مجاہدین پر حملے کرنے والے طیارے بعض اوقات براہِ راست رُوسی ہوائی اڈوں سے اُڑکر آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں افغان عوام کو کسی نے اسلحہ کی امداد نہیں دی، نہ اُنہیں کسی ملک کے فنّی مشورے حاصل ہُوئے، نہ اُن کے لیے کسی ملک نے تربیت کا انتظام کیا۔ جب وہ اُٹھے تو اُن کے پاس پُرانے اور ازکار رفتہ ہتھیار تھے۔ وہ غیر منظم اور غیر تربیت یافتہ تھے، مگر انہوں نے نہ صرف اپنی ضرورت کا اسلحہ اپنے بزدل دشمنوں سے چھین لیا، بلکہ حالات کے مطابق گوریلا جنگ کے تمام قواعد بھی سیکھ لیے اور اس طرح وہ دنیا کی سب سے بڑی گوریلا قوت بن گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ افغان مجاہدین نے دُنیا کو آزادی کی حُرمت اور عقیدے کے تقدس کا بالکل نیا تصوّر دیا ہے۔ اُنہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمان اگر صحیح معنوں میں مسلمان ہو تو وہ دنیا کی سب سے بڑی قوّت بن جاتا ہے۔ اس کے سامنے اسلحہ کی آہنی دیواریں ٹوٹ جاتی ہیں اور فوجوں کا سمندر پایاب ہو جاتا ہے۔ انہوں نے رُوسیوں کو بیک وقت سینکڑوں محاذوں پر اُلجھا کر گوریلا جنگ کی ایک نئی طرح ڈال دی ہے۔ بڑی سے بڑی سپر طاقت کے بس میں بھی نہیں ہے کہ وہ ۲۸ صُوبوں کے ایک ہزار سے زیادہ محاذوں پر ایک ہی وقت میں جنگ لڑ سکے۔ آج بدخشان کی بلندیوں سے لے کر ہلمند کی ترائیوں تک اور ہرات سے کنڑ تک ہر وادی اور ہر ترائی میں مجاہدین کا ایک نہ ایک گروپ روسی استعماریوں کو للکارنے کے لیے موجود ہے۔ پنج شیر، نورستان اور کئی دوسری وادیوں میں تو مجاہدین نے باقاعدہ اپنی حکومتیں قائم کر رکھی ہیں اور رُوسی فوج بار بار حملے کر کے ان علاقوں کی بالشت بھر زمین بھی مجاہدین سے نہیں چھین سکی۔

رُوسی فوجی حکمتِ عمل کی ناکامی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ رُوسی دُنیا بھر میں اپنے

حواری ملکوں سے امداد کی اپیل کر رہے ہیں۔ اگر وہ خود مجاہدین سے نمٹ سکتے تو کیوبا، مشرقی جرمنی، ویت نام، جنوبی یمن اور دُوسرے ملکوں کے گوریلے افغانستان میں نہ لڑ رہے ہوتے، لیکن ان لوگوں نے بھی افغانستان آ کر دیکھ لیا اور جان لیا ہے کہ اس ملک کے گوریلے ان سے کہیں زیادہ شجیع اور ہوشیار ہیں اور وہ ہر جنگی چال کا توڑ کرنا جانتے ہیں۔ اسی حقیقت کو چھپانے کے لیے رُوسی کہہ رہے ہیں کہ افغانستان میں دُوسرے ملکوں کے لوگ مجاہدین کے ساتھ مل کر لڑ رہے ہیں، مگر وہ اپنے حاشیہ بردار ملکوں سے لائے ہُوئے فوجیوں کو دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔

دنیا کی نگاہوں سے افغانستان کی اندرُونی صورتِ حال کو چھپانے کے لیے متعدد تدبیریں کی جا رہی ہیں، مگر حقیقت بھلا اس طرح کہیں چھپتی ہے۔ رُوسی اقوامِ متحدہ کے ایک ترقیاتی منصوبے کے نمائندے کو تبدیل کر کے ایک بلغاروی نمائندے کا تقرر عمل میں لائے۔ انہوں نے دُوسرے ملکوں سے آنے والے اخباری نمائندوں کی آمد پر بھی پابندی عائد کر دی۔ باہر سے آنے والے اور ملک سے باہر جانے والے خطوط پر کڑا سنسر لگا دیا ہے۔ بیرونی اخبارات کا ملک میں آنا ممنوع ٹھہرا دیا ہے۔ بیرونی ممالک کی نشریات سننے پر پابندی ہے۔ ریڈیو پاکستان اور بی بی سی کی فارسی نشریات کو جام کیا جاتا ہے۔ مگر ان تمام ترکیبوں سے بھی وہ سچائی کو نہیں چھپا سکتے اور نہ چھپا سکیں گے۔

اشتراکی بربریت

رُوسی مظالم اور جبر و استبداد کی بہت سی داستانیں دُنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہاں چند ایسے واقعات پیش کیے جا رہے ہیں جو چشم دید گواہوں نے مجھ سے بیان کیے۔

ایک صحافی کا لرزہ خیز قتل

میرے ایک نوجوان صحافی دوست نجیب اللہ رحیق کو اپنی بہن اور بہنوئی کے ہمراہ جس طرح شہید کیا گیا، میرے لیے اس کا تصور ہی المناک ہے۔ انہیں ایک رُوسی فوجی مشیر کے حکم پر گھروں سے گرفتار کیا گیا۔ تینوں کو کچھ نہ بتایا گیا کہ ان کا جُرم کیا ہے۔ مجھے ان کی گرفتاری کے بعد پیش آنے والے واقعات وزارت داخلہ کے تفتیشی شعبے میں کام کرنے والے ایک افسر نے سنائے۔ اس نے بتایا:

"گرفتاری کے بعد تینوں کو وزارتِ داخلہ کی عمارت کے تہہ خانے میں لے جایا

گیا۔ یہاں تین افسر پہلے سے موجود تھے۔ انہوں نے مجھے طلب کیا، تاکہ میں تفتیش کے دوران حاصل ہونے والی "معلومات" کے نوٹ لے سکوں۔ ان پولیس افسروں میں ایک جلاد صفت شخص داؤد تردون (امین اور ترہ کی کے اشارے پر ہزاروں، بے گناہوں کو قتل کرنے والا) بھی تھا۔ بے رحم تردون نے سب سے پہلا حکم یہ دیا کہ نجیب کی بہن کو اس کے بھائی اور شوہر کے سامنے عریاں کر دیا جائے۔ وہ اس شرمناک ظلم پر چیخنے چلانے، مگر کرسیوں کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کے بس میں تڑپنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کے بعد انہیں کہا گیا کہ اگر انہوں نے یہ نہ بتایا کہ مجاہدین سے ان کا تعلق کیا ہے۔ اور مجاہدین کے ٹھکانے کہاں ہیں، تو اس عورت کو ان کے سامنے بے آبرو کیا جائے گا۔ بے گناہ صحافی اور اس کے بہنوئی نے قسمیں کھائیں اور کہا کہ ان کا مجاہدین سے کوئی تعلق نہیں ہے نہ ہی وہ حکومت کے خلاف کسی سرگرمی میں ملوث ہوئے ہیں۔ یہ سن کر تردون آگے بڑھا اور اس نے اپنے جوتوں سے دونوں کے چہروں پر ٹھوکریں ماریں۔ دونوں لہولہان ہو گئے۔ خاتون کو برقی کرسی پر بٹھا کر اس کے ننگے جسم کو بجلی کے جھٹکے دیئے گئے۔ وہ چیختی چلاتی، تو تردون اور اس کے ساتھی فحش بکواس کرتے اور زور زور سے قہقہے لگاتے تھے۔ اس کے بعد تینوں قیدیوں کو زمین پر لٹا کر انہیں ناقابلِ بیان تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ کئی گھنٹے کے مسلسل تشدد کے بعد جب یہ لوگ زبان ہلانے سے بھی معذور ہو گئے، تو تردون یہ کہتا ہوا کمرے سے چلا گیا کہ انہیں انٹیلی جنس کے شعبے میں بھیج دیا جائے۔ اور ان پر اس وقت تک تشدد جاری رکھا جائے جب تک وہ حقیقت اُگل نہ دیں۔ اس کے بعد ان تینوں کو آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر وہاں سے لے گئے۔"

کئی ماہ بعد جب ایک شخص خدائے بر دی انٹیلی جنس کے جبر و تشدد کے کئی دن گزار کر رہا ہو، تو میری اس سے ملاقات ہوگئی۔ میں اسے اپنے دفتر لے گیا۔ (اس وقت تک میں کابل ٹائمز میں ایڈیٹر تھا) میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ انٹیلی جنس کے تعذیب خانے میں وہ نجیب رحیق اور اس کی بہن و بہنوئی کے ساتھ تھا۔ ہم نے وہاں ایک دوسرے سے وعدہ لے رکھا تھا کہ جو بھی زندہ بچ نکلا وہ باہر جاکر دوسروں کے عزیز و اقارب کو ان کے بارے میں حقائق سے آگاہ کرے گا۔ اس شخص نے اپنے نجیب اللہ رحیق، اس کی بہن اور بہنوئی پر بیتنے والے مظالم کی داستان یوں بیان کی:

"ہم تاریک کمروں میں قید تھے۔ ہر روز صبح ہماری پہلی ملاقات ترہ کی کے دست راست اسداللہ سروری سے ہوتی۔ اس کے ہمراہ ایک رُوسی مشیر اور چند بھیانک چہروں والے فوجی بھی ہوتے تھے۔ سروری اور رُوسی مشیر کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور ہر قیدی کو باری باری ان کے سامنے لے جایا جاتا۔ معمولی سے سوال و جواب کے بعد مظالم کا آغاز ہو جاتا۔ ناقابل تصور اور ناقابلِ بیان مظالم کیے جاتے۔ بہت سے لوگ ان سزاؤں کے دوران جاں بحق ہو جاتے۔ بعض کو بازوؤں اور ٹانگوں سے محروم کر دیا جاتا۔ ایک روز جب سب کو شدید بجلی کے جھٹکے دیے جا رہے تھے، تو نجیب اللہ کا بہنوئی بے ہوش ہو گیا۔ اسی بے ہوشی کے دوران اس نے جان دے دی۔ نجیب اللہ کی ریڑھ کی ہڈیاں اور دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں اور وہ ہر روز اپنے لیے موت کی دعائیں مانگتا رہتا تھا۔ اس کی بہن کو ایسی سزائیں دی جاتی تھیں کہ ہم سب شرم کے مارے زمین میں گڑ جاتے تھے۔"

جب میں نے اس سے سزا دینے کے طریقوں کی وضاحت کرنے کو کہا، تو اس نے بتایا۔ نوک دار چارپائیوں پر لٹا کر کوڑوں سے پیٹتے، بجلی کی کرسی پر ننگا کر کے بٹھا دیتے اور

کئی گھنٹے تک مسلسل جھٹکے دیتے ۔ زنبوروں کے ذریعے ناخن اکھاڑتے ۔ ایک دار ڈنڈوں سے جسم کے نازک حصّوں پر ضربیں لگاتے ، آگ میں تپائی ہُوئی سلاخیں آنکھوں میں پھیر کر اندھا کر دیتے ۔ عورتوں کو تمام قیدیوں کے سامنے عریاں کرتے اور ان کی چھاتیاں کاٹ ڈالتے ۔ بچّوں کو ماں باپ کے سامنے پانی میں ڈبو دیا جاتا ۔ ایک قیدی کو دوسروں کے سامنے کھڑا کر کے پہلے اس کے ہاتھ کاٹتے پھر پاؤں ، اس کے بعد اس کے کان اور ناک کاٹتے ۔ اس دوران زور زور سے قہقہے لگاتے رہتے ۔ آخر میں اس کا سر بھی کاٹ دیا جاتا ، یُوں دوسرے قیدیوں کو دہشت زدہ کیا جاتا تھا ۔ کسی شخص کو احتجاج کرنے کا حق نہ تھا ۔ اگر کوئی کلمہ شکایت زبان پر لاتا ، تو اس کی زبان گُدی سے کھینچ لی جاتی تھی ۔

جب میں نے اس سے پُوچھا کہ آپ کس طرح بچ نکلے ، تو اُس نے بتایا :

”مَیں صوبہ بدخشاں کے شہر فیض آباد کا رہنے والا ہوں ۔ میرا نام خدائے بردی ہے ۔ میرا بیٹا خلق پارٹی میں شامل ہو گیا تھا ۔ اگرچہ میں نے اسے کئی بار منع کیا ، لیکن وہ باز نہ آیا ۔ چند ماہ پہلے جب مجاہدین نے بدخشاں میں کمیونسٹوں پر وسیع اور کامیاب حملے شروع کیے ، تو شہری انتظامیہ نے بوڑھوں ، بچّوں اور عورتوں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا ۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ مجاہدین اپنے بیوی بچّوں اور ماں باپ کی خاطر جہاد سے رک جائیں گے ۔ میں بھی گرفتاری کی اسی مہم کا شکار ہُوا ۔ مجھے کابل پہنچا دیا گیا ۔ جب میرے بیٹے کو پتہ چلا ، تو اس نے کابل آکر حفیظ اللہ امین سے ملاقات کی ۔ امین کے حکم پر مجھے رہا کر دیا گیا ۔ جسمانی طور پر تو میں رہا ہو گیا ہُوں ، لیکن اس قید کے دوران مَیں نے جو مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں ، ان کے بعد میں اپنی زندگی کو حرام سمجھتا ہوں ۔“

خدائے بردی نے بتایا :

میرے ساتھ ایک مولوی صاحب عطا مراد بھی تھے۔ ان کے ایمان اور استقامت نے ہم سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ ان کی جیب سے قرآن پاک کا نسخہ نکلا۔ روسی مشیر کے اشارے پر سزا دینے والے جلادوں نے مولوی صاحب سے کہا: "اگر تم قرآن کو زمین پر پھینک دو تو تمھیں رہا کر دیا جائے گا۔" انھوں نے یہ سُن کر قرآن پاک کو سینے سے لگالیا اور چلّاتے ہُوئے بولے: "بدبختو! اس کی بے حرمتی تمھیں تباہ کر دے گی۔"

یہ سُن کر سب ہنس پڑے۔ مولوی صاحب نے قرآن پاک کو پھر سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس پر روسی مشیر نے غصّے میں چیختے ہُوئے حکم دیا کہ اس شخص کو اس طرح سے قتل کیا جائے کہ دوسروں کے لیے عبرت بن جائے۔ مولوی صاحب کو بجلی کے تاروں کے ساتھ جکڑ دیا گیا۔ اس کے بعد ایک بڑے خنجر سے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے گئے۔ پھر آنکھیں نکالی گئیں۔ اس کے بعد زمین پر لٹا کر ان کا سر تن سے جدا کر دیا گیا۔ باقی جسم کے بھی کئی ٹکڑے کر دیے گئے۔ میں آج جب اس شخص کی استقامت کو یاد کرتا ہوں، تو یہ سوچ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں کہ ایک مسلمان وہ تھا اور ایک میں ہوں کہ امین کے معاف کرنے پر رہا ہو گیا اور اب زندگی کی لاش اُٹھائے پھر رہا ہوں ـــــ میری آنکھوں میں وہ منظر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا ہے کہ جب مولوی عطا محمد کو ذبح کیا جا رہا تھا، تو ان کی زبان پر اللہ کے پاک نام کا ورد جاری تھا اور جب ان کا سر کٹ کر دور جا گرا تھا، تب بھی مجھے ان کی زبان سے اللہ اکبر کی آواز سنائی دے رہی تھی ـــــ مولوی صاحب کو شہید کرنے کے بعد روسی افسر نے ہمیں مخاطب کرتے ہُوئے کہا: "دیکھو ہم اشتراکیت کے دشمنوں سے کیا سلوک کرتے ہیں۔" اس کے بعد اس نے تمام قیدیوں کو حکم دیا کہ وہ روس اور "لینن زندہ باد" کے نعرے بلند کریں، مگر چند ہی دہشت زدہ زبانوں سے یہ الفاظ ادا ہو سکے۔ باقی سب نے انکار کر دیا۔"

خدائے بردی نے کہا۔ نہیں معلوم میرے بعد نجیب اللہ رحیق اور اس کی بہن پر کیا

گزری، لیکن چند ماہ بعد متعدد لوگوں نے شہادت دی کہ نجیب اور اس کی بہن بھی بالآخر زندگی کی قید سے رہا ہو گئے۔

پل چرخی کے قیدیوں پر کیا بیتی؟

افغانستان کی سب سے بڑی جیل پل چرخی میں قیدیوں پہ جو مظالم ڈھائے گئے اس سے یہ جیل اب تاریخ کا ایک خونیں باب بن چکی ہے۔ یہاں اُن مظالم کی چند جھلکیاں پیش کی جا رہی ہیں۔ سب سے پہلے کابل کی ایک مظلوم لڑکی کی آپ بیتی ملاحظہ فرمائیں رہا ہونے کے بعد اس کی خراب و خستہ حالت دیکھ کر میں نے اس سے اس کی دلگداز داستان سُنی۔ یہ آپ اسی کی زبانی سُنیں:

"ایک رات جب ہم گھر میں بے خبر سو رہے تھے، نصف شب کے قریب ہمارا دروازہ کسی نے کھٹکھٹایا۔ میرے والد دروازے پر گئے۔ ان کے پوچھنے پر کہ کون ہے" باہر سے بتایا گیا:

"ہم حکومت کے آدمی ہیں اور آپ سے کچھ پوچھنے آئے ہیں"

میرے والد نے دروازہ کھولا، تو کئی فوجی ہاتھوں میں آٹومیٹک گنیں لیے ہوئے ہمارے گھر میں داخل ہو گئے۔ انھوں نے ہم سے پوچھے بغیر گھر میں گھس کر تلاشی لینی شروع کر دی۔ تمام زیورات اور نقد رقوم اُنھوں نے اُٹھا کر پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد ہمیں بتایا گیا کہ وہ ہمیں تفتیشی افسر کے دفتر تک لے جا رہے ہیں۔ جہاں سے معمولی سی پوچھ گچھ کے بعد واپس یہاں چھوڑ جائیں گے۔ کسی پس و پیش کی گنجائش نہ پا کر ہم سب کانپتے لرزتے اُن کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ واپسی کی راہیں ہم پہ بند کی جا چکی ہیں۔ خاندان کے باقی افراد پر کیا بیتی۔ مجھے کچھ پتہ نہیں۔ مجھے اپنا ہی ہوش نہ تھا۔ دوسروں کی خبر کیسے رکھتی۔ نہیں معلوم ان کو کہاں لے جایا گیا۔ کہاں رکھا گیا اور وہ اب کس حال میں ہیں۔ جو کچھ مجھ پر گزری وہ

ڈراؤنے خواب سے زیادہ خوفناک ہے۔

پہلے چند روز تک تو مجھے مختلف تعذیب خانوں میں رکھا گیا۔ یہاں تفتیش ہوتی رہی اور یہ تفتیش کس طرح ہوئی، میری زبان اس کی تفصیل بیان نہیں کر سکتی۔ اس کے بعد مجھے ایک گاڑی کے ذریعے ایک مقام پر لے گئے۔ ایک بڑے گیٹ میں داخل ہوتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ یہ پل چرخی جیل ہے۔ آخر میں زنانہ وارڈ پہنچی جہاں پہلے ہی سینکڑوں عورتیں موجود تھیں۔ دس برس کی کم سن لڑکیوں سے لے کر اسّی سال کی عمر تک کی بدحال اور لٹی پٹی بوڑھیاں۔ میری طرح ان میں سے بھی کسی کی عزت محفوظ نہ تھی۔ نوخیز نوشگفتہ پھول اور کم سن اَن کھلی کلیاں سب درندوں کے ہاتھوں پامال ہو چکی تھیں۔ ہمارے ساتھ پرچم پارٹی کے گھرانوں کی کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ ان پر جسمانی تشدد نہیں کیا جاتا تھا۔ کئی عورتوں نے خودکشی کر کے اس ذلت سے نجات حاصل کر لی، مگر سب کو خودکشی کرنے کی سہولت بھی حاصل نہ تھی۔ اس لیے کہ جیل میں ہر عورت کی سختی سے نگرانی کی جاتی تھی۔ ان کے پاس ایسا کوئی ہتھیار نہ چھوڑا جاتا تھا۔ جس سے وہ خودکشی کا اقدام کر سکیں۔

ایک عورت جیل میں اس حالت میں لائی گئی کہ اس کی زچگی کا وقت قریب تھا۔ دوسرے روز اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ نوزائیدہ بچے کو خوراک کی ضرورت تھی، مگر ماں کا دودھ نہ تھا، اس لیے کہ وہ خود بھوکی پیاسی تھی۔ ایک رات بچہ دودھ کے لیے بلبلانے لگا، تو ہمارا وارڈن غصے میں بھرا ہوا بلاک کی طرف آیا۔ اس نے چیختے ہوئے پوچھا:

"یہ کس کتیا کا بچہ میری نیند خراب کر رہا ہے۔ اسے خاموش کراؤ، ورنہ میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔"

بیچاری ماں نے بچے کو چپ کرانے کی بہت کوشش کی، مگر وہ چپ نہ ہوا۔ وارڈن بکتا جھکتا چلا گیا۔ ایک محافظ نے ترس کھا کر دودھ کا ایک ڈبہ اور فیڈر لا کر ماں کو دے دیا۔ اس نیک دل محافظ کا نام پیر محمد تھا۔ اس نے بچے کی ماں سے کہا کہ وہ دودھ اور فیڈر چھپا کر رکھے،

تاکہ کسی کو پتہ نہ چل سکے۔ دوسرے روز وارڈن آیا، تو اس نے پوچھا "بچہ اب کیوں نہیں روتا؟" ماں کوئی جواب نہ دے سکی، تو اس نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی۔ جب اسے دُودھ کا ڈبہ اور فیڈر نظر آ گیا، تو وہ غصّے میں گندی گالیاں بکنے لگا۔ اس نے بچے کی ماں سے پوچھا۔ "بتاؤ تمہارا کونسا یار یہ لایا ہے؟" وہ خاموش رہی، تو جیلر اُسے ٹھوکریں مارنے لگا۔ پیر محمد یہ دیکھ کر برداشت نہ کر سکا۔ وہ سامنے آ کر بولا:

جناب اس عورت کا کوئی قصور نہیں، میں بچے کو بلکتا نہ دیکھ سکا اور اپنی تنخواہ میں سے یہ دودھ لایا تھا۔

پیر محمد کو اپنے گناہ کی سزا فوراً ہی مل گئی۔ جیلر نے اُسے ہلاک کے برآمدے میں کھڑا کر کے اپنے پستول سے گولی مار کر ختم کر دیا۔ اس کے بعد وہ ظالم ایک ہفتے کے نوزائیدہ بچے کی طرف بڑھا۔ بہت سی عورتوں نے اس کے پاؤں پکڑ کر التجا کی کہ اس معصوم جان کو کچھ نہ کہے، مگر اس نے سُنی ان سُنی کرتے ہُوئے بچے کو زمین پر لٹا دیا اور پھر اپنے فوجی بُوٹ اس پر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ چند ثانیے تک بچے کے گلے سے بے معنی آوازیں نکلیں اور ڈوب گئیں۔ بچہ خاموش ہو گیا، تو اس کی ماں نے پچھاڑیں کھانا شروع کر دیں۔ اس پر وارڈن نے اپنے ایک ساتھی کو حکم دیا کہ اس عورت کو سب کے سامنے بے آبرو کر کے گولی سے اُڑا دو۔

اس کے بعد ظلم کی یہ روایت عام ہو گئی۔ ہر ماہ ہمارا بلاک خالی ہو جاتا، تو اُسے پھر بھر دیا جاتا۔ جیل کے محافظوں میں چند افراد نرم دل تھے۔ وہ ہماری حالت پر کُڑھتے اور بعض اوقات رو بھی پڑتے تھے۔ شہید ہونے والا نیک دل سپاہی پیر محمد بھی انہی سے ایک تھا۔ وہ ہر روز ہمیں تسلی دیتے ہُوئے کہا کرتا تھا:

"کسی دن میں اُن سے سٹین گن چھین کر سب کو ختم کر دوں گا اور تمہیں رہا کرا دوں گا۔"

مگر ہمیں رہا کرانے سے پہلے وہ خود قیدِ حیات سے رہائی پا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد

جب ہماری نچڑی ہوئی لاشیں روسی ایجنٹوں کے لیے بیکار ہوگئیں، تو ہم سے بعض کو رہا کردیا گیا۔ رہا ہونے والوں میں ایک بدقسمت میں بھی تھی۔"

ترہ کی کے خاندان پر کیا بیتی؟

کارمل کے دور میں رہا ہونے والی دو عورتوں نے مجھے پل چرخی جیل کی سیاہ راتوں کا حال سناتے ہوئے یہ بھی بتایا کہ امین کے دور میں ترہ کی خاندان کی کئی عورتوں کو بھی جیل بھیج دیا گیا تھا۔ ان میں اس کی بیوی بھی شامل تھی۔ یہ داستان بیان کرنے والی عورتوں میں سے ایک ستّر سالہ بڑھیا تھی اور دوسری اس کی تیس سالہ بہو۔ انھوں نے بتایا کہ جب جیل میں دوسری عورتوں کو پتہ چلا کہ ترہ کی کی بیوی آئی ہے، تو وہ سب اس کے گرد جمع ہوگئیں اور اُسے ترہ کی کے ظلم وجبر کے طعنے دیے اور کہا:

"اگر تمہارے خاوند نے کمیونزم کی فصل نہ بوئی ہوتی، تو تمہارے حصّے میں یہ جیل کیوں آتی؟"

ترہ کی کی بیوی کو اس وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ اسے جیل بھیجنے والا کوئی اور نہیں، بلکہ اس کے شوہر کا شاگرد وفادار امین ہے۔ اس نے بڑے غرور سے عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

"اگر تم لوگ میرے خاوند کے خلاف بغاوت نہ کرتے، تو آج اس حال کو کیوں پہنچتے؟"

جب اسے یہ پتہ چلا کہ امین ہی نے اُس کے شوہر کو قتل کیا اور اسے قید میں ڈالا ہے، تو وہ ورطۂ حیرت میں ڈوب گئی۔ اس کے بعد سے جیل کی عورتوں نے اس کا جینا حرام کردیا۔ وہ اُسے بددعائیں دیتیں کہ جس طرح تمہارے خاوند نے ملک کو اس حال کو پہنچایا ہے، خدا کرے تمہارا بھی یہی حال ہو اور یہ بددعا اُسے لگ کر رہی۔ جیل کے افسروں نے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے شوہر کی ایک بھتیجی اور اس کے بہت سے

حامی لیڈروں کی بیگمات اور لڑکیوں کی عزّت لُوٹی اور وہ اس پر احتجاج تک نہ کر سکیں۔ تقریباً چار ماہ تک ان عورتوں پر بھی وہی ستم ٹُوٹتے رہے جو دوسروں پر ٹوٹ رہے تھے۔

آخر ۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کو کارمل کے اقتدار میں آنے کے بعد ترہ کی خاندان کی عورتوں کو رہائی ملی۔ رہا کرنے والوں نے جیل کی دوسری عورتوں سے بھی وعدہ کیا کہ ان کے معاملات کی ازسرِ نو تفتیش کی جائے گی۔ اس طرح ان میں سے بعض تو رہا ہو گئیں، لیکن ایک ہزار سے زیادہ عورتوں کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ معلوم نہیں انہیں مار ڈالا گیا یا ابھی تک وہ جیلوں میں پڑی موت کا انتظار کر رہی ہیں۔

ایک بڑھئی کی کہانی

ترہ کی کے اقتدار میں آنے کے ساتھ ہی جن ہزاروں لوگوں کو قید کیا گیا، ان میں کابل کا ایک سادہ لوح بڑھئی بھی تھا۔ یہ شخص لکڑی کاٹنے اور چھیلنے کے سوا کچھ بھی نہ جانتا تھا۔ اسے بغاوت کا مطلب بھی معلوم نہ تھا۔ اسے تو یہ بھی پتہ نہ تھا کہ ترہ کی اور داؤد کے درمیان کیا اختلاف تھا جو داؤد کو قتل کر دیا گیا اور ترہ کی اقتدار کی مسند پر بیٹھ گیا، مگر جو کچھ اس نے پل چرخی جیل میں دیکھا۔ اس نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے مجھے بتایا کہ دوسروں کے مقابلے میں اسے بہت کم سزائیں دی گئیں، لیکن اس کے باوجود وہ بعض اوقات دعائیں کرتا تھا کہ اسے موت آ جائے تاکہ وہ اس عذاب سے بچ جائے۔ بڑھئی یار محمد نے بتایا:

> "انہوں نے میرا جسم جلتے ہُوئے سگرٹوں سے اتنی مرتبہ داغا کہ میرے چہرے سے لے کر پاؤں تک جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں جہاں جلنے کا داغ موجود نہ ہو۔ میرے جسم میں سوئیاں چبھو چبھو کر مجھے چیخنے پر مجبور کیا جاتا۔ ناکردہ گناہوں کا اعتراف کرنے کے لیے انہوں نے مجھے بجلی کے جھٹکے دیے، الٹا لٹکا کر شلوار کے پائنچے بند کر کے ان میں چوہے چھوڑ دیے، لیکن جب انہوں نے دیکھ

لیا کہ یہ شخص تو بات تک نہیں کر سکتا، تو مجھے جیل میں لکڑی کاٹنے کی مشقت پر لگا دیا۔ اس کے بعد میں چونکہ ان کے لیے ایک بے ضرر شخص تھا؛ لہٰذا وہ مجھ سے کچھ نہ چھپاتے تھے۔ اس طرح مجھے جیل میں رہ کر کئی واقعات کا خودبخود علم ہو گیا۔"

باز محمد نے بتایا:

"ابھی مجھے جیل میں چند ہی روز گزرے تھے کہ داؤد خان، نعیم خان اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کی لاشیں جیل میں لائی گئیں۔ ان لاشوں کو جیل کے احاطے میں واقع بڑے بڑے کنوؤں میں پھینک دیا گیا۔ اس کے بعد یہ بات معمول میں شامل ہو گئی۔ پندرہ، بیس افراد کی لاشیں روزانہ لائی جاتی تھیں۔ اُنہیں کنوؤں میں پھینک دیا جاتا تھا۔ جب جیل کے باہر سے آنے والی لاشوں کا سلسلہ بند ہو گیا، تو جیل کے اندر موت کا بازار گرم کر دیا گیا۔ ہر روز جیل کے مختلف بلاکوں سے کچھ لوگوں کو جمع کر کے جیل کے مرکزی علاقے میں لایا جاتا۔ پھر ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دیواروں کے ساتھ کھڑا کر کے گولی مار دی جاتی تھی۔ جب جیل کے پرانے کنویں بھی لاشوں سے بھر گئے، تو نئی خندقیں اور گڑھے کھدوائے گئے۔ جب جیل کے اندر لاشیں ٹھکانے لگانے کی جگہیں ختم ہو گئیں، تو لاشیں ٹرکوں میں بھر کر باہر لے جائی جانے لگیں۔"

پل چرخی جیل میں جن لوگوں کو مارا گیا، کسی نے ان کا گناہ بھی نہ پوچھا۔ ان کی موت کے لیے یہی بات کافی تھی کہ جیل میں مزید قیدی لانے کے لیے جگہ باقی نہ رہتی تھی۔ جب بھی ایسا موقع آتا کہ نئے قیدیوں کی کوئی کھیپ آتی، تو جیل کے افسر پرانے قیدیوں میں سے کچھ لوگوں کو نکال کر باہر لے جاتے اور ابھی نئے قیدی ان کی جگہ بھی نہ لے پاتے کہ اُنہیں قید حیات سے رہا کر دیا جاتا۔ ان کو ختم کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ جیل کے عقب میں وسیع احاطوں میں

بڑے بڑے گڑھے کھدوائے گئے تھے۔ موت کی سزا پانے والے بے گناہوں کو ہاتھ پاؤں باندھ کر ان گڑھوں کے دہانے پر اس طرح کھڑا کر دیا جاتا کہ گولی لگنے سے وہ سیدھے ان گڑھوں میں گر جائیں۔ بعد میں ان خندقوں کو مٹی سے پاٹ دیا جاتا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ باہر کے قیدیوں کو جگہ دینے کے لیے پورا بلاک خالی کروالیا گیا اور کئی سو قیدیوں کو ایک ساتھ اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کو مارنے سے پہلے بڑی بڑی بوریوں میں سی دیا جاتا اور پھر ٹرکوں کے ذریعے انہیں مطلوبہ مقام پر لے جایا جاتا تھا۔

اشتراکی "انصاف" کے نمونے

میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس نے جیل میں بہت طویل عرصہ گزارا تھا۔ اس نے جیل میں گزارے ہوئے دنوں کی المناک یادوں کو اس طرح دہرایا:

"ایک روز میں اپنے دو دوستوں کے ہمراہ ایک دفتر میں بیٹھا تھا کہ دفعتاً دروازہ کھلا۔ ایک فوجی افسر دو سپاہیوں کے ہمراہ داخل ہوا۔ اس نے ہمیں ہمارے ناموں سے پکارا اور ہم سے تصدیق چاہی کہ ہمارے یہی نام ہیں؟ جب ہم نے اقرار کیا، تو اس نے ہمیں اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہمیں بڑے نرم لہجے میں وزارت دفاع تک چلنے کے لیے کہا گیا۔ جب ہم گاڑی پر بیٹھنے لگے، تو انہوں نے ہماری آنکھوں پر پٹیاں باندھ دیں۔ کچھ دیر کے بعد جب ایک کمرے میں ہماری پٹیاں کھولی گئیں، تو پتہ چلا کہ ہم نقیب نامی ایک شخص کے گھر پر ہیں۔ حکومت نے اس شخص کے گھر کو قومی ملکیت میں لے کر جیل خانے میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہاں ہم پر یہ الزام لگایا گیا کہ ہمارا تعلق حکومت کے خلاف تخریبی کارروائیاں کرنے والوں سے ہے۔ ہم نے اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے بہت دلیلیں دیں، مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد

انہوں نے ہمیں اس بُری طرح مارا پیٹا کہ ہم اُٹھنے کے قابل نہ رہے"

پل چرخی جیل میں ہم نے دیکھا کہ کمیونسٹ افسر اور ان کے رُوسی مشیر یہاں کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ کوئی ادنیٰ اہلکار بھی کسی بلاک میں داخل ہوتا، تو تمام قیدی اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ کوئی شخص کھڑا ہونے میں تاخیر کرتا، تو مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دی جاتی تھی۔ جیل کا اعلیٰ افسر نہایت غلیظ فطرت کا مالک تھا۔ وہ قیدیوں کے عجیب وغریب فرمائشیں کرتا وہ ہمیں کہتا "میرے سامنے اپنی ماؤں بہنوں کو گندی گالیوں نکالو" جو انکار کرتا اس کی شامت آجاتی۔ بعض اوقات اسی جرم میں وہ لوگوں کو گولی مار دیتا تھا۔ جب سینکڑوں لوگ مل کر اپنے آپ کو گالیاں دیتے، تو وہ بہت خوش ہوتا اور پاگلوں کی طرح قہقہے بلند کرتا تھا۔

ہر رات عشاء کے قریب گولیوں کی آواز سناٹوں کو توڑ دیتی۔ پہلے پہل ہمیں معلوم نہ تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، لیکن بعد میں ہمیں پتہ چل گیا کہ ہر روز اسی وقت کچھ بے گناہوں کو گولی مار کر ہلاک کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ہماری آنکھیں نادیدنی دیکھنے اور کان ناشدنی سُننے کے عادی ہو گئے۔

امین کے دور میں ترہ کی اور کارمل کے حامیوں ایک بڑی تعداد جیل لائی گئی۔ ان لوگوں کی اکثریت ملحدوں پر مشتمل تھی۔ تمام قیدیوں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ وہ سب خوفزدہ تھے اور دوسرے قیدیوں کی خوشامد کرتے تھے۔ وہ ہم سے ہر وقت پوچھتے رہتے "بتاؤ ہمیں چھوڑیں گے یا مار ڈالیں گے"! ہم ان کو تسلی دیتے، مگر ان کے دلوں میں موت کا خوف ہر وقت جاگزیں رہتا تھا۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے مارے خوف کے چپکے چپکے نماز بھی پڑھنی شروع کر دی۔ طویل وظیفے یاد کرتے اور ہر وقت تسبیح پھیرتے رہتے تھے۔ دوسرے ان پر ہنستے کہ تمہیں اُس وقت خدا کیوں یاد نہ آیا، جب تم نے ملک روس کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ تو وہ سر جھکا کر خاموش ہو جاتے تھے۔

امین کا دور گیا، تو ترہ کی اور کارمل کے ان ساتھیوں کی مشکلات ختم ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ان کی نمازیں بھی ختم ہو گئیں اور وظائف بھی چھوٹ گئے، بلکہ اُدھر رُوسیوں نے جیل پر قبضہ کیا اور امین کی موت کی خبر عام ہُوئی۔ ادھر اُنھوں نے "لینن زندہ باد" اور "کارمل زندہ باد" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ ان کے جانے کے بعد ان کی جگہ پُر کرنے کے لیے امین کے حامی جیل میں آ گئے۔

جب قیدیوں نے ڈاکٹر شاہ ولی کو جیل میں دیکھا، تو مُردہ گائے ہائے ہائے" کا نعرہ بلند کیا۔ عبدالقدوس غوربندی، عبدالرشید جلیلی اور محمود سوما وغیرہ کو بھی جیل میں طرح طرح کے ناموں سے پکارا جاتا تھا۔ ایک دن جب سابق وزیر عبدالکریم میثاق بیت الخلاء کی طرف جا رہا تھا، تو بہت سے قیدیوں نے اسے گھیر لیا۔ سب نے اس پر پھٹکار بھیجتے ہُوئے کہا:

"تم تو کہا کرتے تھے کہ آپ آئندہ میرے بدن پر ایک سے زیادہ سُوٹ نہ دیکھیں گے، مگر تم نے عیش و عشرت کے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ پھر تم کیسے بے غیرت شخص ہو کہ ترہ کی کے دور سے تمہاری اپنی قوم ہزارہ کا قتلِ عام جاری ہے، مگر تم ہمیشہ خاموش رہے؟"

اس پر میثاق کا سر جھک گیا اور اس نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔

"جب ہم پہلے ہی اپنے اعمال کی سزا بھگت رہے ہیں، تو ہمیں مزید شرمندہ کیوں کرتے ہو"

کارمل کے آنے کے بعد پرچمیوں کو تو پہلی ہی شب رہا کر دیا گیا، لیکن ترہ کی کے حامی جیل میں ہی رہے۔ ان لوگوں نے وہ رات بڑی مشکل میں گزاری۔ ساری رات نمازیں پڑھتے اور وظیفے کرتے رہے۔ اُنہیں خطرہ تھا کہ کہیں کارمل انہیں مار نہ ڈالے۔ دوسرے روز جب اُنہیں بھی رہا کر دیا گیا، تو بدمستی میں ہم سے مذاق کرنے لگے۔

"بھائی ہمیں تو نمازوں نے کچھ نہ دیا، اب تم پڑھو نمازیں"

ہمارے ایک ساتھی نے کہا۔

"شکر کرو، تم جھوٹ موٹ کی نمازوں کی وجہ سے ہی بچ گئے۔"

کچھ عرصے کے بعد ہمیں بھی رہائی مل گئی۔ ہمارے ساتھ رہا ہونے والوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی، حالانکہ جب میں جیل میں تھا، تو وہاں تیس ہزار سے زیادہ قیدی موجود تھے۔ باقی پچیس ہزار سے زیادہ قیدیوں کے بارے میں کسی کو خبر نہیں کہ کہاں گئے۔ کارمل انتظامیہ نے بعد میں اعلان کر دیا تھا کہ اب جیل میں کوئی قیدی موجود نہیں ہے اس لیے یقیناً ان لوگوں کو کارمل نے ختم کرا دیا ہو گا۔

گورنروں کے مظالم

جیلوں کے باہر بعض لوگوں پر جو مظالم ہوئے۔ ان کا تذکرہ بھی بہت دردناک ہے۔ ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کو یاد کرنے کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے، جو کچھ بتاتے ہیں وہ بھی ان رونگٹے کھڑے کرنے والے واقعات کی محض ایک جھلک ہے۔ زخموں اور ضربوں نے ان کے دل مردہ کر دیے ہیں اور ان کے دماغوں پر صدمات کی گرد بٹھا دی ہے۔ شمالی صوبے بدخشاں سے آئے ہوئے ایک سفید ریش بزرگ نے مجھے بتایا کہ روسیوں نے فیض آباد شہر کے سینکڑوں علما، فضلاء اور سفید ریش بزرگوں کو گرفتار کر کے دریائے آمو میں پھینک دیا۔ صوبے کے گورنر اور پانی اور بجلی کے وزیر منصور ہاشمی نے ان مظالم میں خود حصہ لیا۔ ان لوگوں کو اس جرم میں پکڑا گیا کہ وہ لوگوں کو جہاد پر ابھارتے تھے۔ انہیں ہوائی جہازوں اور ہیلی کاپٹروں پر بٹھا کر روسی سرحد پر واقع دریائے آمو تک لے جا کر دیئے اور گہرے پانیوں میں دھکیل دیا گیا۔

بزرگ نے کہا:

"ان لوگوں کا جو شہید کیے گئے، اس کے سوا کوئی گناہ نہ تھا کہ انہوں نے اسلام

پر قائم رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ دہریت کو قبول کر سکتے تھے۔ نہ اشتراکیت کے غلام بننا چاہتے تھے۔ ہماری بستیوں پر ہوائی جہازوں سے بمباری کی گئی۔ مسجدوں کو آگ لگا دی اور پھر پروپگینڈا کیا کہ پاکستانی مولوی مسجدوں کو آگ لگا رہے ہیں۔ لوگوں کے گھروں میں کمیونسٹ زبردستی داخل ہو کر تلاشی لیتے اور ہر قیمتی چیز اٹھا لے جاتے تھے۔ بعد میں کہا جاتا کہ فلاں فلاں بستیوں پر مجاہدین نے ڈاکہ ڈالا ہے۔ خواتین کی بے حرمتی کی جاتی، لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جاتا اور پھر مشہور کر دیا جاتا کہ یہ سب کچھ مجاہدین نے کیا ہے۔"

صوبہ پکتیا کے شہر گردیز سے ایک فوجی نوجوان اپنے خاندان کو لے کر کابل آ گیا تھا اور ہمارے پڑوس کے مکان میں کرائے پر رہنے لگا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ رُوسیوں نے پکتیا پر اس قدر بمباری کی ہے کہ کوئی بستی باقی نہیں چھوڑی۔ انہوں نے ٹینکوں اور بکتر بند گاڑیوں کے ذریعے پُرامن شہریوں کو روندا اور پے در پے ظلم روا رکھا جو اُن کے بس میں تھا۔ اس نے بتایا کہ کٹھ پتلی انتظامیہ کے صوبائی گورنر فقیر محمد نے مختلف قبائل کو آپس میں لڑانے کے لیے سازش کی۔ بعض لوگوں کو اس مقصد کے لیے رقمیں دی گئیں، مگر علاقے کے عوام نے اس سازش کو ناکام بنا دیا۔ اس کے بعد جب لوگوں نے دیکھ لیا کہ ان کی جان و مال کے ساتھ ان کے عقائد کو بھی شدید خطرہ لاحق ہے، تو وہ پہاڑوں پر چلے گئے اور ان کی عورتوں تک نے بندوقیں سنبھال لیں۔

قندھار سے آنے والے ایک دوسرے فوجی نے مجھے بتایا کہ اس صوبے کے گورنر صاحب جان صحرائی کے حکم پر شہر کے بہت سے لوگوں کو پکڑ لیا گیا۔ ان کو کچھ نہ بتایا گیا کہ اُن کا جرم کیا تھا۔ انہیں گورنر ہاؤس کے احاطے میں باندھ کر زمین پر ڈال دیا گیا اور پھر گورنر کے اشارے پر ایک ٹینک انہیں کچلتا ہوا گزر گیا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ خلقی شہر سے دو

معمر بزرگوں کو پکڑ کر گورنر کے پاس لے گئے۔ ان کے بارے میں شکایت تھی کہ وہ خلقیوں کے مقابلے میں مجاہدین کی حمایت کرتے ہیں۔ ان دونوں کو کسی تحقیق و تفتیش کے بغیر درختوں سے الٹا لٹکا کر نیچے ایک الاؤ دہکا دیا گیا۔ اس طرح یہ دونوں خدا کے بندے جل کر راکھ بن گئے۔ اس داستانِ ظلم کے راوی کا نام نذیر احمد تھا۔ وہ بعد میں مجاہدین سے جا ملا تھا۔ حال ہی میں وہ بھی شہید ہو گیا ہے۔

جلال آباد کے کئی لوگوں نے مجھے ننگرہار کے بے رحم گورنر انجینئر ظریف کے مظالم کی کہانیاں سنائیں۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کر رہا ہوں۔ اس شخص کے سامنے دو ایسے میاں بیوی لائے گئے جن کی عمریں ساٹھ، ستر سال سے متجاوز تھیں۔ انہیں طورخم کے قریب پاکستانی سرحد عبور کرتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا، گورنر نے اُن سے پوچھا کہ وہ ملک چھوڑ کر کیوں جا رہے تھے، تو اُنہوں نے جواب دیا: "ہم اپنے ایمان اور عقیدے کی حفاظت کیلئے ہجرت کر کے جا رہے تھے اور یہ ہمارے خدا کا حکم بھی ہے۔" گورنر نے حکم دیا، ان دونوں کو نو نو کوڑے مارے جائیں۔ اس حکم پر عملدرآمد کیا گیا۔ اس کے بعد ابھی ان میں جان باقی تھی کہ گورنر کے حکم پر اُنہیں ایک گڑھا کھود کر زندہ دفن کر دیا گیا۔

روسیوں کی دہشت گردی

یہ اگست ۱۹۸۰ء کا واقعہ ہے۔ ایک پنج شیری ڈرائیور روسی ساخت کی والگا ٹیکسی میں چار افراد کو بٹھا کر کسٹم ہاؤس کے قریب پہنچا، تو اُسے سامنے سے روسی ٹینکوں اور ٹرکوں کا ایک بڑا قافلہ آتا دکھائی دیا۔ ٹیکسی ڈرائیور کو پل چرخی فیکٹری تک جانا تھا۔ اس نے ٹینک دیکھے تو گاڑی کو سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر لے آیا، تاکہ روسی ٹینکوں کو کھلا راستہ مل جائے، مگر ایک روسی ٹینک سڑک کو چھوڑ کر فٹ پاتھ پر دوڑتا ہوا ٹیکسی کی طرف بڑھا اور اسے کچلتا ہوا گزر گیا۔ گرد و نواح کے لوگوں نے چیخ و پکار کی اور ٹینک کو اشارے سے روکا۔ ٹینک رک گیا۔ اس میں سے ٹینک ڈرائیور ہنستا ہوا باہر آیا۔ مشتعل لوگوں نے

اس سے احتجاج کیا تو کہنے لگا:

"ہمارے بیس تیس آدمی روزانہ آپ کے ملک میں مارے جاتے ہیں۔ ہم نے کبھی آپ سے شکایت کی؟ اگر آپ کے چار پانچ آدمی مرگئے یا زخمی ہو گئے، تو کیا ہوگیا؟"

یہ کہتا ہُوا وہ ٹینک میں بیٹھ کر آگے روانہ ہوگیا۔ لوگوں نے کچلی ہوئی ٹیکسی سے لوگوں کو نکالا۔ چاروں سواریاں ختم ہوچکی تھیں۔ ڈرائیور شدید زخمی تھا۔ اسے لوگوں نے ہسپتال پہنچایا جہاں اس نے آخری ہچکیوں کے دوران اس ظلم کی روداد بیان کی اور چل بسا۔

ڈرائیور کے رشتے دار اور دوسرے مرنے والوں کے پسماندگان کابل کے مقامی پولیس افسر صمد اظہر کے پاس گئے اور اُس سے تمام احوال بیان کیا۔ پولیس افسر نے ان لوگوں کو یہ کہتے ہوئے اپنے دفتر سے نکال دیا کہ تمہارے چند عزیز مارے گئے اور وہ بھی اپنی غلطی سے، مگر ہمارے رُوسی دوست روزانہ اپنے سینکڑوں آدمی ہماری خاطر قربان کر رہے ہیں اور ہماری حفاظت پر اربوں روبل خرچ کرتے ہیں، مگر اُنہوں نے تو کبھی ہم سے شکایت نہیں کی۔

جمہوریت مارکیٹ میں لُوٹ مار

۱۹۸۰ء کا ایک اور واقعہ بھی رُوسی دہشت گردی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایک رات رُوسی فوجیوں نے شہر کے اندر گھس کر لُوٹ مار کی۔ اُنھوں نے مشہور افغان سٹور کے قریب جمہوریت نامی مارکیٹ سے لاکھوں روپے کا قیمتی سامان لُوٹا۔ وہ جیپوں میں سوار ہو کر آئے۔ دکانوں کے تالے توڑ کر تجوریوں سے ساری نقدی اُڑالی اور ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو، گھڑیاں، کپڑے اور سگرٹ وغیرہ جیپوں میں بھر کر ساتھ لے گئے۔ اس کے بعد اُنہوں نے مارکیٹ کو آگ لگادی۔ رات پچھلے پہر جب فائر بریگیڈ کی گاڑیاں آگ بجھانے پہنچیں، تو رُوسی فوجی مارکیٹ

کے سامنے بندوقیں تانے ان کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ اُنہوں نے فائر بریگیڈ کو اس وقت تک اندر جانے سے روکے رکھا جب تک مارکیٹ جل کر خاک نہ ہوگئی۔ صبح جب دکاندار آئے، تو اُنہیں پولیس نے بمشکل اجازت دی کہ وہ اپنی دکانوں کا بچا کھچا سامان جمع کرسکیں، مگر جب دکاندار دکانوں میں داخل ہُوئے، تو ملبے میں گئے، پلاسٹک اور لکڑی کی راکھ کے سوا کچھ باقی نہ تھا۔ اس پر اُنہوں نے پولیس سے پُوچھا کہ "اگر یہ آگ اتفاقی تھی، تو دکانوں میں ریڈیو، ٹیپ اور گھڑیوں وغیرہ کے جلے ہُوئے ڈھانچے موجود ہوتے۔ اگر یہ کسی نے شرارت کی ہے تو بھی دکانوں کی بھاری تجوریاں کہاں گئیں؟ پولیس افسروں نے لوگوں کو صبر کی تلقین کی اور ان سے وعدہ کیا کہ نئی دکانوں کی تعمیر میں حکومت مدد دے گی۔

بعد میں تیمور شاہ نامی ایک پولیس افسر نے اس پُوری واردات سے پردہ اُٹھایا۔ اس نے بتایا کہ رات ایک بجے کے قریب چار رُوسی ٹرک فوجی جیپیں اور ایک بکتر بند گاڑی مارکیٹ کے پاس آکر رُکی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے رُوسی فوجیوں کو اترتے دیکھا تھا۔ ان لوگوں نے چوکیداروں کو بھگا دیا اور سڑک کی ناکہ بندی کرنے کے بعد دروازوں کے تالے توڑ دیے اور مال واسباب لُوٹ کر مارکیٹ کو آگ لگا دی، تاکہ چوری کے بجائے آتشزدگی کا واقعہ معلوم ہو۔ مارکیٹ سے فائر بریگیڈ کا دفتر صرف ۲۰۰ میٹر دُور ہے، اس لیے شعلے وہاں سے صاف نظر آتے تھے۔ آگ بجھانے والی گاڑیاں جلد ہی آپہنچی تھیں، مگر رُوسی اس وقت تک ان گاڑیوں کا راستہ روکے کھڑے رہے، جب تک اُنہیں مارکیٹ کے جل کر خاکستر ہونے کا یقین نہ ہوگیا۔

کمیونزم نے کیا دیا ؟

داؤد کے خاتمے پر عوام کو مژدہ سنایا گیا کہ صدیوں کی غیر منصفانہ بادشاہت ختم ہو چکی ہے۔ اب عوام کا دور ہے، ان کے حقوق انہیں ملیں گے اور ان کے ساتھ ظلم نہ کیا جائے گا، لیکن ابھی اس اعلان کی صدائے بازگشت فضاؤں میں مرتعش تھی کہ کابل میں ظلم و ستم کا آغاز ہو گیا۔ بعض لوگوں کو تو کمیونزم کی مخالفت یا اسلام کی حمایت پر سزائیں دی لیکن کچھ ایسے لوگوں کو بھی معاف نہ کیا گیا جو اشتراکی حکمرانوں کو اپنا سمجھتے تھے، جو فریاد لے کر ان کے دربار میں آتے تھے۔

حساب چکا دیا

اقتدار سے پہلے ترہ کی کابل کے دکانداروں اور اپنے پڑوسیوں کا مقروض تھا۔ ایک دن اس نے ان سب کو دربار میں بلایا۔ اس میں ترہ کی کے بعض رشتہ دار، دوست، ہمسائے اور دکاندار شامل تھے۔ دکانداروں میں سبزی فروش بھی تھے اور قصائی بھی، حجام بھی اور کریانہ

فروش بھی۔ ترہ کی نے ان کے سامنے طویل تقریر کی۔ انہیں صورتِ حال کی تبدیلی سے آگاہ کیا۔ جب وہ لوگ رخصت ہونے لگے، تو ان میں سے چندایک نے اپنے پیسوں کے بارے میں دریافت کیا۔ ترہ کی نے ان سے کہا۔ "دیکھو، مجھے اس طرح مخاطب کیا، تو زبان کھنچوا دوں گا۔ کبھی اپنے گھر آؤں گا، تو تمہارا حساب چکادوں گا، لیکن اگر کسی نے میرے بارے میں یہ بتایا کہ وہ ہمارا مقروض ہے، تو وہ زندہ نہ رہے گا۔"

فریاد کا جواب

ایک اور شخص ترہ کی سے شناسائی کی بنا پر اس سے ملنے گیا۔ ملاقات میں اس نے ترہ کی سے فریاد کی کہ اس کا بھائی انقلاب کی رات سے گم ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اسے آپ کے کچھ فوجیوں نے پکڑا تھا۔ اس کے بعد سے پتہ نہیں کہ کہاں ہے؟ ترہ کی نے اپنے سیکرٹری سے کہا۔ اسے اس کے بھائی سے ملا دو۔ اس کے بعد اس بے چارے کا بھی کچھ پتہ نہیں چلا۔ اپنے بھائی کی تلاش میں وہ بھی گم ہو گیا۔

بدتمیز حکمران

ترہ کی کا دست راست اور بعد میں اس کا قاتل بننے والا حفیظ اللہ امین بھی نہایت بداخلاق آدمی تھا۔ وہ ہفتے میں دو مرتبہ وزارتِ خارجہ کے ہال میں دربار لگاتا جہاں شاہی طمطراق سے بیٹھتا اور فریادیوں کی فریادیں سنتا تھا۔ وہ عاجز لوگوں سے متکبرانہ انداز میں گفتگو کرتا اور بعض اوقات انہیں گالیاں بھی دیتا تھا۔ اس کے صرف ایک "دربار" کی روداد سن لیجیے:

ایک عورت اپنے دو معصوم بچوں کے ساتھ آئی۔ کافی دیر کے بعد جب اس کی باری آئی، تو اس نے روتے ہوئے یوں فریاد کی:

"میرے خاوند کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔ ایک سال گزر گیا اس کا کچھ پتہ نہیں چلا۔

میرے معصوم بچوں پر رحم کریں اور اس کا پتہ بتا دیں۔"
امین نے اُسے نہایت تُند لہجے میں مخاطب کیا:
"تمہارا خاوند یقیناً حکومت کا مخالف ہوگا۔ یا تو وہ پاکستان بھاگ گیا ہوگیا، اگر نہیں گیا، تو سمجھ لو کہ مر گیا۔ جاؤ تم دوسری شادی کر لو اور بچوں کو یتیم خانے میں داخل کرا دو ـــــ اور کمرے سے نکل جاؤ۔"

ایک عورت آئی اور کہنے لگی، میرا شوہر امریکہ میں ہے، میں اس کے پاس جانا چاہتی ہوں مجھے اجازت دی جائے۔ امین نے کہا۔"امریکہ مت جاؤ، خاوند کو یہاں بلا لو۔" مگر عورت کی التجا پر امین کو "رحم" آ گیا۔ اس نے درخواست پر لکھا: اسے دس ہزار افغانی کے بدلے پاسپورٹ دے دیا جائے۔" عورت نے پھر التجا کی۔"جناب والا میں غریب ہوں، مجھ پر رحم کیا جائے۔" امین نے کہا،"تم نے کسی امیر آدمی یا تاجر سے شادی کیوں نہیں کی۔ اگر تمہیں میرا فیصلہ منظور نہیں، تو اسے مسترد کر دیتا ہوں، جاؤ بھاگ جاؤ۔"

مغرور شخص

ایک خانہ بدوش عورت آئی۔ امین نے اسے دیکھتے ہی انتہائی نفرت سے کہا:
"کرسی پر مت بیٹھو، جاؤ وہاں نیچے بیٹھو۔"

وہ بیچاری نیچے بیٹھ گئی، جب اپنی باری پر آئی، تو اس نے فریاد کی:"جناب! میرے شوہر اور جوان بیٹے کو ایک سال پہلے آپ کے سپاہیوں نے پکڑا تھا۔ اس کے بعد سے کچھ پتہ نہیں کہ وہ کہاں گئے۔ آپ یا تو مجھے بتائیں کہ وہ کہاں ہیں یا پھر مجھے بھی مار ڈالیں۔ امین نے بڑی رعونت سے ایک محافظ کو حکم دیا۔ اسے لے جاؤ یہاں سے۔ اگر باہر جا کر یہ شور مچائے، تو اسے "قصاب گھر" پہنچا دینا۔" عورت نے سڑک پر پہنچ کر فریاد شروع کر دی۔"لوگو! امین میرے شوہر اور بیٹے کا قاتل ہے۔ پولیس نے اس کا تعاقب کیا۔ اسے گاڑی میں ڈال

کر لیے گئے۔ بعد میں کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ اس بے چاری پر کیا گزری۔

بچّہ سقّہ کا دَور

کابل کی کٹھ پتلی انتظامیہ نے عوام پر جو ظلم و ستم ڈھائے، ان سے قطع نظر اگر اس کے اہلکاروں کی اہلیت کو بھی دیکھا جائے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بچّہ سقہ کا دَور لوٹ آیا ہو۔ ترہ کی، امین اور کارمل نے ایسے لوگوں کو اقتدار میں شریک کیا جو علم، اخلاق، انسانیت ہر چیز سے عاری تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرکاری اداروں میں کام چوری کی لہر چل پڑی اور ہر طرف لُوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔

نائب وزیرِ اعظم، وزیرِ صحت اور وزیرِ خارجہ کے مناصب پر فائز رہنے والا ڈاکٹر شاہ ولی دُنیا کے مسائل اور ملکی معاملات سے بے بہرہ شخص تھا۔ لوگ اس کی معلومات اور علم پر ہنستے تھے۔ ریڈیو کابل کے ایک معمولی کلرک خیال محمّد کتواری کو وزیرِ اطلاعات و ثقافت بنا دیا گیا۔ اس شخص کو طالب علمی کے زمانے میں بھی غبی سمجھا جاتا تھا۔ ریڈیو مرمّت کرنے والا ایک مستری ظریف رُوسی پٹھو ہونے کی بنا پر انجینئر ظریف خاں کہلانے لگا۔ بعد میں اس انجینئر کو وزارت اور گورنری کے مناصب پر فائز کر دیا گیا۔ اسد اللہ سروری اور اسد اللہ امین نامی دو افراد اعلیٰ مناصب تک پہنچے جو کسی طرح انسان کہلانے کے بھی مستحق نہ تھے۔ اسلم وطن جار اور سید محمّد گلابزوئی جو فوج میں ٹینک چلانے والے ادنیٰ سپاہی تھے اور انہوں نے نائب حوالدار بننے کے خواب بھی نہ دیکھے تھے، وزیر بنا دیے گئے۔

یہ تو تھا وزیروں کا حال، دوسرے اہم عہدوں پر بھی ایسے لوگوں کا تقرّر کیا گیا کہ وہ لوگوں میں لطائف کا موضوع بن گئے ــــ بگرامی ٹیکسٹائل ملز کے ایک مزدور کو جس کا نام تلاش تھا، کٹھ پتلی انتظامیہ کی عنایت سے پُوری ملز کا جنرل مینجر بنا دیا گیا۔ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس کے ایک مشین چلانے والے مزدور کو جس کا نام محمّد عوض تتی زادہ تھا۔ پریس کا سب سے بڑا

عہدہ دے دیا گیا۔ چپڑاسی کے عہدے پر فائز ایک شخص مومن خان کو جو دستخط بھی نہ کر سکتا تھا اور انگوٹھا لگایا کرتا تھا، صرف پارٹی کی رکنیت کی بنا پر محکمہ آب رسانی میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ ایک نوجوان طالب علم کو جو ابھی زیر تعلیم تھا، کالج کا پرنسپل بنا دیا گیا۔ ایک ان پڑھ سپاہی کو صوبے کا گورنر اور چھٹے ہوئے بدمعاش کو پولیس کمشنر کے اعلیٰ عہدے پر متعین کر دیا گیا۔

اقربا پروری

ان نا اہل لوگوں نے اپنے عزیز و اقارب کو اپنے گرد اکٹھا کیا اور ان کی جھولیاں بھر دیں۔ جس کے ساتھ دشمنی تھی، اس کو گرفتار کرا دیا۔ انہوں نے اپنے ماتحتوں سے جانوروں کا سا سلوک روا رکھا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ ملازمتیں چھوڑ کر جانے لگے۔ کمیونسٹ افسروں نے ان کی جگہ اپنے رشتے داروں کو دے دی۔ کام آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا۔ دفتروں میں لوگ گپ شپ کے لیے جانے لگے۔ ملکی معیشت تباہ ہو گئی۔

جب کسی ملک کے حکمران ہی سرکاری خزانے کو لوٹنا شروع کر دیں اور شب و روز عیاشی کرنے کے سوا انہیں کوئی کام نہ ہو، تو ان کے ماتحتوں کا کیا حال ہو گا۔ اس وقت افغانستان کے سرکاری محکموں کا جو حال ہے۔ اسے دیکھ کر پچاس برس پہلے کا وہ دور یاد آ جاتا ہے۔ جب امان اللہ خان کی جلاوطنی کے بعد بچہ سقہ نے ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اگرچہ اس دور میں جبر و تشدد اس پیمانے پر نہ ہوا تھا لیکن سرکاری اداروں میں نا اہل غنڈے اور جاہل لوگ اسی طرح دندناتے پھرتے تھے اور ملک کا خزانہ بھی اسی طرح لوٹا جا رہا تھا۔

اس وقت افغانستان میں سرکاری ملازمتوں پر صرف وہی لوگ باقی رہ گئے ہیں جو یا تو حکمران پارٹی کے ارکان ہیں یا ان کے بھائی، بیٹے اور قریبی عزیز ہیں۔ اپنی نا اہلی کی بنا پر وہ خود تو کوئی کام جانتے نہیں، جو کچھ ان کے محکموں کے روسی سربراہ حکم دیتے ہیں،

انجام دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر رُوسی ان سے یہ کہیں کہ وہ اپنے ہی گھر کی جاسوسی کریں۔ انہیں رپورٹ دیں اور اپنے ماں اور باپ کی مخبری کریں، تب بھی وہ انکار نہیں کر سکتے۔

وطن فروش غنڈے

اپریل ۱۹۷۸ء میں خلق و پرچم پارٹیوں کے ممبروں کی مجموعی تعداد ۴۸۲۳ تھی۔ ان میں سے کچھ تو رُوس کے باقاعدہ وظیفہ خوار تھے اور کچھ سادہ لوح نوجوان اور نوخیز طلبہ تھے۔ ان کی اکثریت کابل کے رہنے والوں پر مشتمل تھی۔ ملک کے باقی علاقوں میں کمیونسٹوں کے اثرات نہ ہونے کے برابر تھے۔ برسر اقتدار آنے کے بعد کٹھ پتلی انتظامیہ کو اپنے حامیوں میں اضافے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو انہوں نے ہر شخص کا نام اپنی ممبر شپ کی کتابوں میں درج کرنا شروع کر دیا۔ دوسرے کمیونسٹ ممالک کی روایت کے مطابق تمام آوارہ لوگوں، راہزنوں، غنڈوں اور ڈاکوؤں کو پارٹی کی ممبر شپ دے دی گئی جو لوگ کابل کے بازاروں اور گلیوں میں چرس بیچتے پھرتے تھے پارٹی کے "معزز" ارکان بن گئے۔ بعض لوگوں نے اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے لیے اور بعض نے مجبوری کی بنا پر پارٹی کی رکنیت قبول کی۔ وہ سرکاری ملازم جن کو ملازمتوں سے نکالے جانے کا ڈر تھا، وہ بھی پارٹی میں شامل ہو گئے، لیکن نئے شامل ہونے والوں کی بڑی اکثریت ناخواندہ لوگوں پر مشتمل تھی۔ وہ لوگ جنہیں نہ کمیونزم کے بارے میں کچھ معلوم تھا، نہ اسلام کے بارے میں۔

اس کے بعد ملک میں دانشوروں اور پڑھے لکھے لوگوں کا قتل عام شروع ہو گیا۔ کچھ جانیں بچا کر بھاگ گئے۔ اشتراکی چاہتے تھے کہ ملک میں کوئی پڑھا لکھا شخص باقی نہ رہے، تاکہ وہ باقی لوگوں کو بے وقوف بنا سکیں، لیکن وہ شاید یہ نہ جانتے تھے کہ اَن پڑھ اور ناخواندہ مسلمان بھی ایک پڑھے لکھے کمیونسٹ سے کہیں زیادہ اپنے عقیدے اور نظریے کا وفادار ہوتا ہے! چنانچہ جہاد کا آغاز ہوا، تو یہی ناخواندہ لوگ کمیونزم کو جڑوں سے اکھاڑنے کے لیے میدان میں نکل آئے؛ البتہ کچھ لوگ اپنے مفادات کی خاطر کابل حکومت اور رُوس کی حمایت کرتے رہے۔

ان لوگوں نے رُوس کو ہر قسم کی مدد دی ، ہر قسم کا سہارا دیا۔ ان غنڈوں ، ان پرمشوں اور نالائقوں نے کیمونزم کا ساتھی بننے اور وطن فروشی کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ ان کی اکثریت پہلے ہی ملک بھر میں بدنام تھی ۔ یہ لوگ پہلے بھی ملک میں لوٹ مار کرتے تھے ، اب بھی اُنہوں نے وہی وطیرہ اپنائے رکھا ۔ اب قانون کا ڈر بھی ختم ہو چکا تھا کہ قانون کی پابندی سے وہ مستثنیٰ تھے ۔

پارٹی کے ان ارکان نے کیمونزم کے اس ُ زرّیں ٗ اصول کو اپنا لیا کہ انہیں صرف کھانا ، پینا اور سونا ہے۔ اس کے بدلے میں چاہے کوئی ان کو گدھا سمجھ کر ان پر سواری کرے اُن کے ہاتھوں ان کے عزیزوں کو قتل کرا دے یا ان کی ناموس پامال کرے۔ کچھ ایسے بے غیرت بھی نکلے جنہوں نے اپنے گھروں کی عزت کی پروا بھی نہ کی۔ یہ لوگ رُوسی فوجی افسروں اور ان کے اعلیٰ مناصب پر فائز ایجنٹوں کے لیے سامانِ عشرت مہیا کرتے ہُوئے بعض اوقات اپنے گھروں کی عزت تک لٹا دیتے ہیں ۔

کیمونسٹ ممالک کی یہ روایت ہے کہ وہاں علم و دانش کے دروازے عوام و خواص پر بند کر دیے جاتے ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ اپنے مُلک میں چھپنے والی کتابوں ، رسالوں اور اخبارات کے علاوہ کچھ پڑھ سکے ، یا اپنے ریڈیو کے بغیر کچھ سن سکے۔ یہاں کے یونیورسٹی پروفیسر بھی دُنیا کے حالات سے بے خبر ہوتے ہیں ۔ عام لوگ اور پارٹی کے ورکر تو مارکسزم کے سوا کچھ نہیں جانتے اور اپنی پارٹیوں کے رہنماؤں کے نظریات کے سوا کسی دوسری چیز سے آگاہ نہیں ہوتے۔ جہاں تک دُنیا کے دوسرے ممالک کا تعلق ہے ، یہ لوگ بسا اوقات ان کے نام تک نہیں جانتے۔ افغانستان میں بھی علم کے تمام سوتے خشک کر دیے گئے ہیں۔ اب وہاں کی کتابیں صرف اشتراکیت کی تعلیم پر مبنی ہیں اور اخبارات و جرائد برزنیف اور کارمل کی تقریروں اور تعریفوں سے بھرے ہوتے ہیں ۔

رُوسیوں نے سوچا تھا کہ وہ ان ہتھکنڈوں سے افغانوں کو اپنا غلام بنا لیں گے ، کیونکہ انہی

ترکیبوں کو کام میں لاکر وہ مشرقی جرمنی، بلغاریہ، ہنگری، پولینڈ وغیرہ کے لوگوں کو مطیع بنا چکے تھے۔ وہ غنڈوں اور ڈاکوؤں کی مدد سے کیوبا، ایتھیوپیا، شمالی کوریا اور ویت نام کے لوگوں کو زیر کرنے میں کامیاب رہے تھے۔ مجاہدین نے ان کی سازش ناکام بنا ڈالی۔ یہاں آزادی کے متوالوں نے رُوسیوں اور کٹھ پتلی انتظامیہ کے فوجیوں کے ساتھ ساتھ ان ننگِ وطن غنڈوں اور بدمعاشوں کو بھی گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا جو رُوس سے تعاون کر رہے تھے۔

وہ لوگ جو کل تک رُوسی فوج کو مجاہدین کے ٹھکانوں سے آگاہ کیا کرتے تھے، آج اپنی جان بچانے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ ان کی اکثریت قتل کی جا چکی ہے۔ جو باقی رہ گئے ہیں، وہ کابل اور بڑے شہروں میں چلے گئے ہیں، تاکہ مجاہدین کے حملوں سے محفوظ رہ سکیں۔ رات دن وہ گھروں میں چھپے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسے بہت سے لوگوں نے مجاہدین کو پیغامات بھیجے ہیں کہ اگر انہیں معاف کر دیا جائے، تو وہ ان کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں، لیکن مجاہدین نے تہیہ کر رکھا ہے کہ ایسے ہر شخص کو ختم کر کے دم لیں گے جس نے وطن فروشی میں حصّہ لیا اور بے گناہ مسلمانوں کا خون بہایا۔ اس لیے اب خدا کی زمین ان پر تنگ ہو چکی ہے۔

جھوٹ کا سیلاب

ترہ کی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد شہر کے ایک ہوٹل سے چند پاکستانیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ لوگ مزدوری کے سلسلے میں یورپ جانا چاہتے تھے۔ جن دنوں وہ ہوٹل میں مقیم تھے، شہر میں ترہ کی کے خلاف کئی مظاہرے ہو چکے تھے۔ اُن غریب پاکستانیوں کو امریکی ایجنٹ اور پاکستانی جاسوسوں کے ماہر کی حیثیت سے عوام میں متعارف کرایا گیا۔ حکومت نے ایک پریس کانفرنس منعقد کی جس میں ان لوگوں نے جان کے خطرے کے پیشِ نظر کابل انتظامیہ کے

الزامات کی تصدیق کی ـــــ اس پریس کانفرنس میں راقم الحروف نے ان بے گناہوں سے علحدگی میں ملاقات کی تھی۔ اُنہوں نے بتایا کہ اگر وہ کابل حکومت کی کہی ہوئی باتوں کو نہ دُہرائیں گے، تو اُنہیں قتل کر دیا جائے گا۔ یہ لوگ کافی عرصے تک جیل میں رہے اور تره کی انتظامیہ اُنہیں اپنے پروپیگنڈے کے لیے استعمال کرتی رہی۔

اس کے بعد رُوس کے حکم پر ایران کی کمیونسٹ پارٹی "تودہ" کے کچھ ارکان کو کابل لایا گیا۔ ان لوگوں نے اخباری نمائندوں کے سامنے "اقرار" کیا کہ ایرانی حکومت نے ہمیں افغانستان بھیجا تھا۔ تاکہ ہم یہاں گڑبڑ پھیلائیں۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ بعض افغان تنظیموں نے انہیں ہرات میں بدنظمی پھیلانے کے لیے بھاری رقوم دی ہیں۔ رُوس اور کابل کے ذرائع ابلاغ نے ان لوگوں کے حوالے سے پروپیگنڈا کیا کہ ہمسایہ ممالک افغانستان کے معاملات میں مداخلت کے لیے اپنے ایجنٹ بھیج رہے ہیں۔

مصر سے ایک کمیونسٹ کو کابل لایا گیا۔ اس سے ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بیانات دلوائے گئے۔ اس شخص نے "اقبالِ جرم" کرتے ہوئے بتایا کہ مجھے مصر کی حکومت نے مجاہدین کی مدد کے لیے بھیجا ہے۔ مجاہدین کے پاس جو اسلحہ ہے وہ امریکہ، چین اور پاکستان نے فراہم کیا ہے۔ اس مصری نے سب سے دلچسپ بات یہ بتائی کہ امریکہ نے پاکستان کو کئی سو بمبار طیارے اور ہزاروں ٹینک دے رکھے ہیں جو افغانستان پر حملے کے لیے تیار کھڑے ہیں شاید انہی دنوں حملہ کر دیں۔ اس بیان کو دو برس ہونے کو آئے، مگر ابھی تک "حملہ" نہیں ہُوا

ایک امریکی سیاح کو روپے کا لالچ دے کر اس سے اپنی مرضی کا بیان دلوایا گیا۔ اس شخص کا نام لی (LEE) تھا۔ پھر وہ دن آئے کہ لی صاحب گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے تھے اور کوئی اُنہیں پوچھنے والا نہ تھا۔ اُنہیں ملک جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ ایک دن میں اپنے ایک رفیق کار کے ساتھ دفتر میں بیٹھا تھا کہ مسٹر لی اچانک دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ ہم سے تعارف کرانے کے بعد اس نے بتایا کہ مَیں نے پیسوں کے لالچ میں اگران (حکمران پارٹی)

کی بات مان لی تھی۔ اب میں ریڈیو اور اخبارات کو بیان دے چکا ہوں، تو نہ مجھے پیسے دیتے ہیں نہ مُلک سے جانے دیتے ہیں۔ کئی بار وزارتِ خارجہ والوں کے پاس جا چکا ہوں، وہ کہتے ہیں صبر کرو، ہم تمہیں مشرقی جرمنی بھجوا دیں گے۔ اب میں بیمار ہوں، آپ میری مدد کریں۔"

ہم اس شخص کے ساتھ تعاون کرتے، تو اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے، اس لیے ہم نے اسے ہاتھوں کے اشارے سے کہا کہ ہم انگریزی نہیں سمجھتے۔ ہماری بات سن کر وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ کہنے لگا: "میں نے سُنا تھا کہ سوشلسٹوں میں رحم کا مادہ نہیں ہوتا، اب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چل دیا۔ بعد میں معلوم نہیں اس پر کیا بیتی۔ اسے یقیناً اپنی بوئی ہوئی فصل اپنے ہاتھوں سے کاٹنی پڑی ہو گی۔

دُنیا کو جھوٹ دکھانے کے لیے اتنا اہتمام کیا جاتا ہے اور سچ چھپانے کے لیے دہے کی وہی دیوار تعمیر کی گئی ہے جو کمیونسٹوں کی روایت ہے۔ تمام غیر سرکاری اخبارات بند ہیں۔ غیر مُلکی ایجنسیوں کے نمائندوں کو مُلک سے نکال دیا گیا ہے۔ سیّاحوں پر بھی افغانستان کی سرزمین بند کر دی گئی ہے۔ ایک امریکی وقائع نگار اور محقق لُوئی ڈُپرے (Luis Dupree) سے کو اس لیے افغانستان سے نکال دیا گیا کہ وہ افغانستان کے موضوع پر کئی کتابیں لکھ چکا تھا۔ کہا گیا کہ وہ "تخریب کاروں" کا ساتھی ہے اور پاکستان کے راستے ان کی مدد کرتا ہے۔ کچھ عرصہ جیل میں رکھنے کے بعد ڈپرے کو مُلک سے نکال باہر کیا گیا۔

مغربی ذرائع ابلاغ

رُوس نے افغانستان پر مسلط ہونے کے ساتھ ہی پروپیگنڈے کی یہ مہم تیز تر کر دی ہے۔ افغان مجاہدین کے پاس ایسے ذرائع نہیں جن سے وہ جھوٹ کی قلعی کھول سکیں۔ دُنیا حقیقتِ حال جاننے کے لیے مغربی ذرائع ابلاغ پر انحصار کرتی ہے، لیکن مغربی ممالک

کے اخبارات اور نشریاتی ایجنسیاں افغانوں کے ایسے نادان دوست بنے ہوئے ہیں. جو غیر مصدقہ اطلاعات کو نشر کرکے فائدے کے بجائے اُلٹا نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان ذرائع کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ وہ حالات کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھنے اور اسی نقطہ نظر سے دُنیا کو دکھاتے ہیں ۔ وہ جہاد فی سبیل اللہ کے مفہوم سے آگاہ نہیں ، اس لیے افغانستان کی جدوجہد کو قوم پرستوں اور حریت پسندوں کی جدوجہد قرار دیتے ہیں ۔ وہ مجاہدین کو آزادی کے متوالے تو قرار دیتے ہیں ، لیکن یہ نہیں بتاتے کہ ان کی جدوجہد کا مرکز و محور اسلام ہے اور وہ وطن پرست نہیں ، خدا پرست ہیں ۔

بعض اوقات مغربی ممالک کی نیوز ایجنسیاں خبروں کو تصدیق کیے بغیر نشر کر دیتی ہیں ۔ جیسے گزشتہ برس انھوں نے ڈاکٹر اناہیتا راتب زادہ کی موت کی خبر نشر کی ، کارمل کی خودکشی کی کوشش کرنے کی خبر دی ۔ اس طرح امین برسر اقتدار آیا ، تو بعض مغربی اخبارات نے اسداللہ سروری اور مزدوریار کے قتل ہو جانے کی اطلاع نشر کی ، حالانکہ وہ لوگ رُوسی سفارت خانے میں چھپے بیٹھے تھے ۔ اسی طرح کہا گیا کہ اسلم وطن جار صوبہ پکتیا کے محاذ پر مجاہدین سے آملا ہے ۔ اس سے کابل انتظامیہ کو تقویت ملتی ہے ۔ رُوسی ذرائع ابلاغ ایسی جھوٹی خبروں کے حوالے سے سچی خبروں کو بھی جھوٹ کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور سچی خبروں پر سے بھی لوگوں کا اعتماد اُٹھ جاتا ہے ۔

پشتونوں کے دوست

داؤد کے دور میں رُوسیوں نے افغانستان اور پاکستان کو ایک دوسرے سے دُور کرنے کے لیے "پشتونستان" کا مصنوعی مسئلہ پیدا کیا ۔ قومی عصبیت کی آگ بھڑکائی گئی ۔ افغانستان میں پشتو بولنے والے لوگوں میں یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ پاکستان میں ان کے قومی اور لسانی بھائیوں پر ظلم ہو رہا ہے ۔ اگرچہ صوبہ سرحد کے پٹھان پاکستان کے قیام کے لیے زبردست

قربانیاں دے چکے تھے اور وہ دل وجان سے اپنے ملک کو ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن دیکھنا چاہتے تھے، مگر سرحد کے اس پار یہ تاثر پھیلایا جا رہا تھا کہ وہ اپنی آزاد اور علحدہ ریاست قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض شخصیتوں کا مصنوعی امیج بنایا گیا۔ ان کی بعض حکومتوں سے ناراضگی کو علحدگی پسندی کا روپ دے کر افغانستان کی حکومت ان کے حقوق کی چیمپین بن بیٹھی۔

سرحد کے ایک مشہور لیڈر عبدالغفار خان، جنہوں نے قیامِ پاکستان کی مخالفت کی تھی اور پاکستان بننے کے بعد کچھ عرصہ جیل میں رہے تھے، رہائی کے بعد افغانستان پہنچے، تو افغان حکومت کو ان کی شکل میں ایک موزوں شخص ہاتھ آ گیا۔ باچا خان کو آزادی کی جدوجہد کرنے والے لیڈر کے طور پر افغانستان میں خاصی عزت حاصل تھی۔ افغان حکومت نے حکومت پاکستان سے ان کی ناراضگی سے فائدہ اٹھایا۔ روس اور بھارت نے بھی ان کی آڑ میں یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ سرحد اور بلوچستان کے عوام کے حقوق کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ افغان حکومت کو پروپیگنڈے کے لیے کروڑوں روپے کی امداد فراہم کی گئی۔ کابل میں باچا خان کے طویل قیام اور حکام سے قریبی تعلقات نے اس تاثر کو اور بھی گہرا کیا۔ اس کے بعد اجمل خٹک بھاگ کر کابل جا پہنچے اور حکومت سے سیاسی پناہ لے کر پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہو گئے۔ افغانستان کے عوام اس مذموم مہم اور اس کے پیچھے چھپے ہوئے عزائم سے بے خبر تھے، مگر وہ باچا خان سے اپنی عقیدت کی بنا پر سرحد اور بلوچستان کے لوگوں سے "ہمدردی" رکھتے تھے، لیکن افغانستان پر روس کے قبضے نے پوری صورتِ حال کو تبدیل کر کے رکھ دیا۔

روسی جارحیت کے بعد جب لاکھوں مہاجرین کے قافلے سرحد عبور کر کے پاکستان پہنچنے لگے، تو ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہاں آکر ان پر روس، بھارت اور کابل کی حکومتوں کے پروپیگنڈے کی حقیقت کھلی۔ انہوں نے دیکھا کہ پشتونوں کے حقوق کے چیمپین ان پر

بیتنے والی قیامت پر ذرا بھی غمگین نہیں ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں خوش آمدید کہنے والوں میں باچا خان اور ان کے ساتھی پیش پیش ہوں گے۔ وہ ان کے زخموں پر پھاہا رکھیں گے اور انہیں سینے سے لگائیں گے، مگر یہ دیکھ کر ان کی آنکھیں کھل گئیں کہ خان عبدالغفار خان اپنے بیانات اور انٹرویوز میں روس کی جارحیت کی مذمت کرنے کے بجائے ان ممالک کی مذمت کر رہے جنہوں نے روسی اقدام کی مخالفت کی ہے۔ وہ پاکستان کی مذمت کر رہے ہیں جس نے مہاجرین کو پناہ دی ہے اور ان کے ساتھی روسی سفارت کاروں کے اعزاز میں استقبالیے دیتے اور خوشی کے جشن مناتے پھر رہے ہیں۔

یہی نہیں، بلکہ باچا خان کابل گئے اور وہاں جا کر ایک بیان جاری کیا کہ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ اور طالبات وقت گزاری کے لیے مظاہرے کرتے ہیں، یہ ان کی عادت ہے، حالانکہ کابل میں سینکڑوں طلبہ اور طالبات کو شہید کیا جا رہا تھا اور سینکڑوں ایسے تھے جنہیں ان کے تعلیمی اداروں سے گرفتار کیا گیا تھا اور آج تک ان کی زندگی یا موت کا کچھ پتہ نہیں۔ اس بیان سے باچا خان کے ساتھ افغان عوام کی ساری عقیدت کافور ہو گئی ہے۔ اب وہ اچھی طرح ان کا روپ دیکھ چکے ہیں، انہوں نے جان لیا ہے کہ جو عناصر قبائلی، قومی اور لسانی عصبیتوں کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں، بالآخر لوگ ان کی حقیقت سے آگاہ ہو کر ان سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ افغان عوام کسی ایسے شخص کو کبھی معاف نہیں کریں گے جنہوں نے ان کی مبنی بر انصاف جدوجہد کی حمایت کرنے کے بجائے روس کا ساتھ دیا ہے۔

اس لحاظ سے اشتراکیت کی اس "افادیت" سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی آمد سے افغانوں نے اپنے پرایوں کو پہچان لیا۔ بہت سے "دوست" اس آزمائش میں ساتھ چھوڑ گئے بہت سے لوگوں کے چہروں سے ملمع اتر گیا اور افغانوں نے دیکھا کہ ان کو سینے سے لگانے والے وہی لوگ نکلے جو ان کے دینی بھائی تھے۔ ان کے ساتھ لسانی اور قبائلی رشتوں کے

دعوے کرنے والے ساتھ چھوڑ گئے۔

چرسی فوج

رُوسی فوج بزدل ہی نہیں، دُنیا کی سب سے زیادہ لالچی اور پست اخلاق فوج بھی ہے۔ راقم الحروف ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے کابل میں رُوسیوں کی بزدلی، لالچ اور بداخلاقی کے کئی مظاہرے دیکھے ہیں۔ کابل کی خیر خانہ کالونی کے چوک میں رُوسی فوجی پوسٹ لگا رکھی تھی۔ اس کے اطراف میں رہنے والے کچھ افغان بچوں نے پروگرام بنایا کہ ان رُوسیوں کو کسی طرح نقصان پہنچایا جائے۔ رُوسی ان بچّوں سے امریکی ساخت کے سگرٹ، چابیوں کے چھلّے، چرس، گھڑیاں اور پتلونیں وغیرہ خریدتے تھے۔ اس کے بدلے میں وہ بعض اوقات اپنے پستول اور کارتوس تک فروخت کر دیتے تھے۔ خصوصًا چرس تو ان کی ایسی کمزوری تھی جس کے لیے اُن کے بڑے بڑے افسر بھی ان بچّوں سے التجائیں کرتے رہتے تھے۔ جب بچّوں نے اچھی طرح اعتبار جمالیا، تو مارچ ۱۹۸۰ء میں تین بچّوں نے ان سگرٹوں میں چرس کے بجائے بارود بھر دی۔ ایسی سگرٹیں پینے والے کئی رُوسی فوجی اپنے ہونٹ، مونچھیں اور ناک جلا بیٹھے۔

یہ واقعہ رُوسی ہائی کمان کے علم میں آیا، تو اس کی تحقیقات کی گئی۔ کابل کے تمام ایسے بچّوں کو جمع کیا گیا جو سگرٹ بیچتے تھے، مگر وہ تین بچے ہاتھ نہ آسکے، شاید وہ شہر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اس کے بعد رُوسی فوجیوں کو منع کر دیا گیا کہ وہ عام لوگوں سے میل جول اور خرید و فروخت نہ کریں، لیکن جن لوگوں کو چرس کی لت پڑ گئی تھی، اُنھوں نے اس کے حصول کے لیے دوسری راہیں نکال لیں۔ کابل کے بعض اوباش لوگ اُنہیں چرس دے کر ان سے ہر قسم کے کام لینے لگے۔ چرس نوشی کا یہ مرض اب کابل سے نکل کر دوسری رُوسی فوجی چھاؤنیوں میں بھی پھیل رہا ہے۔

واخان پر رُوسی قبضہ

سطح مرتفع پامیر کی تنگ پٹی جسے یونانی مورخوں نے وخش کا نام دیا، اب واخان کہلاتی

ہے۔ ہندوکش کی انتہائی بلندیوں پر واقع یہ علاقہ افغانستان کے شمالی صوبے بدخشاں میں واقع ہے۔ اس کی سرحدیں چین اور رُوس کے علاوہ چترال اور گلگت میں پاکستان سے بھی ملتی ہیں، اس لیے اُسے خصوصی جغرافیائی اہمیت حاصل ہے۔ اس چھوٹے سے علاقے پر قبضے کے لیے رُوس صدیوں سے دانت جمائے بیٹھا تھا۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب برِّصغیر میں انگریزوں کا راج تھا اور وسطِ ایشیا میں رُوس کی کارفرمائی تھی، تو دونوں استعماری طاقتوں نے افغانستان کو ہڑپ کرنے کی بار بار کوشش کی۔ رُوس کی نگاہیں بحیرۂ عرب کے گرم پانیوں پر مرکوز تھیں۔ جب کہ برطانیہ اسے دریائے آمو کے اُس پار روکنا چاہتا تھا۔ اُس کشمکش اور افغانوں کی زبردست مزاحمت سے مجبور ہو کر دونوں طاقتوں نے افغانستان کو غیر جانبدار "بفر ایریا" کی حیثیت دے دی۔ ۱۸۷۳ء میں رُوس اور برطانیہ نے دریائے آمو کو افغانستان اور آمو کے درمیان قانونی سرحد تسلیم کر لیا، لیکن بوجوہ پامیر کے اس علاقے کی سرحدوں کا تعیّن نہ کیا جا سکا۔ اس علاقے کو جو متنازعہ نہ تھا، بلکہ افغانستان میں شامل تھا، رُوس نے کئی بار کوشش کی کہ اپنے ملک میں شامل کر لے، افغانوں اور برطانیہ نے اس کی کوششیں ناکام بنا ڈالیں۔ ۱۸۹۱ء میں رُوسیوں نے واخان پر قبضے کے لیے بہت بڑا حملہ کیا۔ غیور افغانوں نے مُنہ توڑ جواب دیا۔ برطانیہ ثالثی کے لیے آگے بڑھا۔ اس نے رُوس کو واخان کی سرحد کے تعیّن پر رضامند کر لیا۔ ۱۸۹۵ء میں سرحد بندی کا کام شروع ہُوا جو ایک سال میں مکمّل کر دیا گیا۔

اسی موقعے پر چین کے ساتھ چالیس میل لمبی سرحد کا تعیّن بھی کیا گیا۔ ابتدا میں چین نے سرحدی کمیشن کا بائیکاٹ کیا تھا، لیکن ۱۹۶۲ء میں دونوں ممالک نے سرحد کی اسی نشاندہی کو تسلیم کرتے ہُوئے اسے قانونی حیثیت دے دی۔ اس سرحد کو چند سال قبل تک افغان اور رُوسی حکومتیں تسلیم کرتی چلی آئی ہیں، بلکہ ۱۹۴۶ء میں اس کی مزید توثیق کی گئی جب رُوسی حکومت نے افغانستان کے ساتھ دریائے آمو کی قانونی حیثیت پر ایک

نئے معاہدے پر دستخط کیے تو اس معاہدے میں واخان کو افغانستان کے غیر منفک جزو کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔

۱۹۸۰ء میں پوری دنیا نے یہ خبر حیرت سے سُنی کہ رُوس نے تمام معاہدوں کو پسِ پشت ڈالتے ہُوئے واخان کو اپنے ملک میں شامل کر لیا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ کابل کی کٹھ پتلی انتظامیہ احتجاج کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ وہ تو اپنی مرضی سے سانس تک نہیں لے سکتی، مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح اس کی افغانستان پہ جارحیّت کو کوئی قانونی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اسی طرح واخان پر اس کا غاصبانہ قبضہ بھی ناجائز اور غیر قانونی ہے اور انشاءاللہ جب افغان کسی دن رُوس کو اپنی سرزمین کے دوسرے علاقوں سے نکالیں گے، تو اُسے واخان بھی واپس کرنا پڑے گا۔

چشم دید

۱۹۸۰ء کے موسم بہار میں جب ملک کے پہاڑی علاقوں پر مجاہدین کی گرفت مضبوط ہو رہی تھی اور کارمل انتظامیہ دن رات یہ دعوے کر رہی تھی کہ پورے ملک میں اسے کنٹرول حاصل ہے اور عوام اس کا ساتھ دے رہے ہیں، میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں کسی جگہ جاکر خود دیکھوں کہ حقیقت کیا ہے، چنانچہ ایک روز میں خاموشی سے کابل کے شمال میں سفر کرتا ہوا صوبہ پروان کے ایک قصبے گلبہار جا پہنچا۔ یہاں ایک بڑی ٹیکسٹائل مل ہے، اس میں میرا ایک دوست کام کرتا تھا۔ میں اس سے ملنے کا بہانہ بناکر گیا ـــــ میں یہ سن چکا تھا کہ وہاں روزانہ جھڑپیں ہوتی ہیں، لیکن ریڈیو کابل ہمیشہ کہتا کہ گلبہار کے تمام وطن پرست عوام نے حکومت کی دفاعی تنظیموں میں شمولیت اختیار کرلی ہے اور وہ غیر ملکی مداخلت کاروں کو ختم کرنے کا عزم کیے ہوئے ہیں۔

میں دن کے وقت وہاں پہنچا، تو ہر سو خاموشی طاری تھی۔ ریڈیو کابل کا پیش کردہ، تو کوئی منظر میرے دیکھنے میں نہ آیا، لیکن رات کا اندھیرا ہونے کے بعد جو کچھ میں نے دیکھا اس نے

کارمل انتظامیہ کے جھوٹ کے سارے پردے چاک کر دیئے۔ میں نے دیکھا کہ شام ہونے کے ساتھ ہی علاقے کے سناٹے بندوقوں کے فائروں سے ٹوٹ گئے اور دن بھر کے خاموش اور پُرسکون چہروں والے لوگ اندرونی جوش اور جذبوں کی حدت سے تپنے لگے۔ ابتدا میں فائرنگ دریائے گلبہار کے اُس پار سے کی گئی، چند منٹ تک سامنے پہاڑ پر سے شعلے سے اُبھرتے اور مٹتے نظر آئے اور کچھ دیر تک مشین گن کی آواز سُنائی دی جس کے بعد خاموشی ہو گئی۔ اس کے فوراً بعد دریا کے اس پار سے رُوسی فوجی مورچوں سے توپیں آگ اگلنے لگیں۔ پہاڑ پر سرچ لائٹ ڈالی جانے لگی اور روشنی کے گولے چھوڑے گئے۔ پُورا پہاڑ ایک روشن سکرین کی طرح نظر آنے لگا، مگر وہاں مجاہدین کا دُور دُور تک پتہ نہ تھا۔ میں بھی حیران تھا کہ فائرنگ کس نے اور کہاں سے کی تھی؟ آدھی رات تک رُوسی توپیں خاموش نہ ہوئیں۔ اس کے بعد جوں ہی روسی مطمئن ہو کر اپنے کیمپ کی طرف بڑھے، تو مجاہدین نے بستی کے عقب سے ان پر حملہ کر دیا۔ اس کے بعد فائرنگ اور انسانی آوازوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یہ شور ایک گھنٹے کے قریب رہا۔ اگلی صبح مجھے معلوم ہُوا کہ مجاہدین نے اس کامیاب شب خون میں دس رُوسی ٹینک اور ایک بکتر بند گاڑی تباہ اور دو جیپیں نذر آتش کرنے کے علاوہ بہت سے رُوسی فوجیوں کو ہلاک کر دیا ہے۔ اس معرکے میں مجاہدین کے ہاتھ خاصا اسلحہ بھی آیا۔ صبح کی روشنی ہوئی، تو مَیں نے دیکھا کہ گاؤں پر وہی خاموشی اور سکوت طاری ہے اور جنگ کے اثرات کہیں دکھائی نہیں دیئے، مگر جب میں گاؤں سے باہر نکلا، تو رُوسی کیمپ کی تباہی کا منظر دیکھنے کے علاوہ دریائے گلبہار پر دھوئیں کی چادر تنی ہُوئی دیکھی۔ آگے بڑھا تو مجھے دریا کے اس پار ایک شخص سبز ہلالی پرچم اُٹھائے جاتا دکھائی دیا۔ مَیں نے دریا عبور کیا اور اس کے پاس جا کر اس سے پُوچھا۔ تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے مسکراتے ہُوئے کہا:

"غازی، مجاہد، شہید اور فتح!!"

مَیں نے اسے رات کی کامیابی پر مبارک باد دیتے ہُوئے اپنا تعارف کرایا۔ جب

اسے معلوم ہوا کہ میں اخبار نویس ہوں، تو وہ مسکراتا ہُوا مجھ سے گلے ملا۔ میں نے اس سے مجاہدین کی جنگی حکمتِ عملی کے بارے میں سوالات کیے، تو اس نے بتایا کہ وہ ہر جنگ میں اپنی حکمت عملی تبدیل کر دیتے ہیں، تاکہ دشمن ان کے ارادوں سے آگاہ نہ ہو سکے۔ گزشتہ رات کے بارے میں اس نے کہا۔ ہمارے سینکڑوں بھائی رات کی تاریکی میں گاؤں کے مختلف گھروں میں پہنچ چکے تھے۔ اس کے بعد طے شدہ منصوبے کے مطابق پہاڑ پر سے ہمارے چند ساتھیوں نے مختلف سمتوں سے فائر کیے، تاکہ دشمن یہ سمجھے کہ ہم پہاڑ کی طرف سے اس پر حملہ کرنے والے ہیں۔ رات کا وقت اور دریا سامنے ہونے کی وجہ سے ان کے لیے پہاڑ پر چڑھنا مشکل تھا اس لیے انہوں نے اپنی توپوں کی ساری آگ پہاڑی چٹانوں پر پھینک دی۔ جب ہم نے دیکھا کہ ان کے پاس گولہ بارود کم رہ گیا ہے اور نیند ان کی آنکھوں میں بھر چکی ہے، تو عقب سے ان پر اچانک حملہ کر دیا۔

مجاہد نے مجھے بتایا کہ ہمیں روسیوں پر دو وجوہ سے برتری حاصل ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ہم ایمان سے سرشار ہیں اور وہ اس سے محروم ہیں۔ ہم شہادت کی موت کے طالب ہیں اور وہ موت سے بھاگتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں عوام کی حمایت حاصل ہے۔ ہر بستی کا ہر گھر ہماری پناہ گاہ ہے۔ لوگ ہمارے ساتھ مل کر جہاد کرتے ہیں، ان کی خواتین ہمارے لیے کھانا پکاتی ہیں اور ہماری کامیابی کی دعائیں مانگتی ہیں۔ ان کے معصوم بچے دور دراز پہاڑی مورچوں پر ہمیں کھانا پہنچاتے ہیں۔"

اس کے بعد میں ایک دوسرے مجاہد کے ساتھ اس مقام پر گیا جہاں ٹوٹے ہُوئے ٹینک اور جلی ہوئی گاڑیاں پڑی ہُوئی تھیں۔ میں نے ایک ٹینک کے قریب ایک لاش دیکھی۔ یہ جلی ہُوئی لاش کسی رُوسی سپاہی کی تھی۔ اس کے ہاتھ پر گھڑی بندھی ہُوئی تھی اور اس کے ساتھی بھاگتے ہُوئے اُسے پیچھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایک اور رُوسی کی لاش ایک درخت کے نیچے پڑی ہُوئی تھی۔ شاید اس نے درخت کے پیچھے چھپ کر جان بچانے کی کوشش

کی تھی۔ لیکن رات کی تاریکی میں بھی گولی نے اس کے سر کو ڈھونڈ ہی لیا تھا۔ اس مجاہد بھائی نے مجھے بتایا کہ میرا تعلق جمعیت اسلامی افغانستان سے ہے۔ اس نے مجھے دعوت دی کہ آج ہمارا ایک اور آپریشن "متوقع ہے تم فلاں وقت پہ گاؤں کے جنوب میں آجانا تاکہ اپنی آنکھوں سے مجاہدین کو حملہ کرتے دیکھ سکو۔ میں نے اس سے وعدہ کر لیا۔

اس ناقابلِ فراموش نظارے کے بعد جب میں اپنے دوست کے گھر پہنچا، تو وہاں سب لوگ سخت گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں رات کی لڑائی میں مارا گیا ہوں۔ میں نے سیر کا بہانہ کیا اور انہیں حقیقت حال اس لیے نہ بتائی کہ ممکن ہے وہ مجھے اگلے پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے روک دیں۔ مقررہ وقت پر میں اپنے دوست کو ساتھ لے کر بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیا۔ مجاہدین نے میری آؤ بھگت کی اور مجھے لے کر تیزی سے ایک پناہ گاہ میں پہنچا دیا۔ یہ جگہ سڑک سے کچھ زیادہ دور نہ تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے شہر کی جانب سے ایک فوجی جیپ آتی دکھائی دی۔ یہ دن کے ساڑھے دس بجے کا وقت تھا۔ دو مجاہد اچانک میرے پہلو سے اٹھے اور سڑک پر پہنچ کر اس جیپ پر آٹومیٹک رائفلوں کے فائر کیے۔ جیپ سڑک کے کنارے اُلٹ گئی اور اس میں سے نکل کر بھاگنے والے گولیوں کا نشانہ بن گئے۔

مجاہدین نے جیپ کو سیدھا کیا اس کی تلاشی لی اور مرنے والوں کا اسلحہ لے کر واپس میرے پاس آگئے۔ اس آپریشن میں بمشکل پانچ منٹ صرف ہوئے ہوں گے۔ اگلے روز مجھے گلبہار میں اس جیپ میں مرنے والوں کے بارے میں پتہ چلا۔ ان میں سے ایک شخص صوبہ پروان میں خلق پارٹی کا جنرل سیکرٹری، ایک کمیونسٹ ہیڈ ماسٹر، ایک فوجی افسر اور ایک اُن کا محافظ تھا۔

میں ابھی گلبہار میں تھا کہ مجاہدین نے ٹیکسٹائل ملز میں کام کرنے والے مزدوروں کو حکم دیا کہ وہ فیکٹری میں کام کرنا بند کر دیں۔ اس پر فوری عمل ہوا۔ ملز میں کام بند ہو گیا۔ فیکٹری کی بجلی سپلائی کاٹ دی گئی۔ فیکٹری کی انتظامیہ نے کارکنوں سے بار بار اپیل کی وہ کام پر واپس آجائیں، مگر انہوں نے انکار کر دیا اور آخر میں مطالبہ کیا کہ جب تک فیکٹری سے خلقی افسروں

اور جنرل منیجر کو نکال نہ دیا جائے گا وہ کام پر واپس نہ آئیں گے۔ کئی ماہ تک فیکٹری بند رہی۔ اس کے بعد جب مجاہدین اسلحہ کی کمی کے مسئلے سے دوچار ہوئے، تو انھوں نے پیچھے ہٹ کر وادیٔ پنج شیر پر اپنی گرفت کو مضبوط کر لیا؛ چنانچہ فیکٹری میں کام دوبارہ شروع ہو گیا، مگر صرف چند کارکن واپس آئے، کیونکہ باقی لوگ مجاہدین کے ساتھ مل کر جہاد میں مصروف ہو گئے تھے۔

باپ نے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے ختم کیا

۱۹۸۰ء کے موسم گرما میں مجھے ایک ایسے ناقابل فراموش واقعے سے دوچار ہونا پڑا جس نے میری زندگی کا رُخ ہی تبدیل کر دیا۔ میرا ایک قریبی دوست نور محمد کابل کے شمال میں واقع ایک بستی گل درہ کا رہنے والا تھا۔ مجھے یُوں تو معلوم تھا کہ وہ کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہو چکا ہے، لیکن میرا رجحان جاننے کی وجہ سے وہ اکثر میرے سامنے کمیونسٹوں کو بُرا بھلا کہتا رہتا تھا۔ ایک جمعے کو جب میری چھٹی تھی، تو مَیں اس کے ہمراہ گل درہ چلا گیا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ چھٹی کا دن اس کے گاؤں کے پُرفضا ماحول میں گپ شپ کرتے ہُوئے گزاروں گا، لیکن جب میں گاؤں پہنچا، تو خلافِ توقع لوگوں کی نگاہوں کو بدلا بدلا سا پایا۔ وہ ہم دونوں کو نفرت اور حقارت سے دیکھ رہے تھے اور آؤ بھگت کی افغان روایت کے برعکس ان کی نگاہوں سے شعلے برستے دکھائی دیتے تھے۔ نور محمد کے گھر کے افراد نے بھی نہایت سرد مہری سے میرا استقبال کیا۔ مَیں نے اسے توجہ دلائی کہ اس بار مجھے تمہارے ہاں اجنبیت سی محسوس ہو رہی ہے، تو اس نے میری بات کو ہنس کر ٹال دیا۔ چند منٹ بعد اس کے والد گھر سے ملحقہ حجرے میں داخل ہُوئے جہاں میں نور محمد کے ساتھ بیٹھا تھا، تو مَیں نے سمجھا شاید وہ مجھے خوش آمدید کہنے آئے ہیں، لیکن اُنھوں نے میرے خدشے کو مزید تقویت دی۔ اُنھوں نے میرے لیے کوئی اچھا کلمہ یا خیر سگالی کا فقرہ نہیں کہا، بلکہ آتے ہی قدرے طنزیہ اور درشت لہجے میں مجھے یُوں مخاطب کیا:

"کیوں بیٹا کیسے تکلیف کی، کس بے گناہ کو پکڑوانے آئے ہو؟"

اب معاملہ میری سمجھ میں آگیا۔ وہ مجھے اپنے بیٹے کا ہم خیال سمجھ رہے تھے اور شاید یہ خیال کر رہے تھے کہ میں سرکاری پارٹی کا جاسوس ہوں۔ ابھی میں حیران ہی تھا اور کچھ جواب نہ دے پایا تھا کہ نور محمد نے میری صفائی پیش کر دی۔ اس نے اپنے والد کو خوشامدانہ لہجے میں بتایا، "ابا جان میرے دوست کا کمیونسٹ پارٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو آپ کی طرح کا نیک اور شریف آدمی ہے، آپ اس کی بے عزتی نہ کریں اور پھر یہ ہمارا مہمان ہے۔"
اس کے والد نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر ہم دونوں کو لعنت ملامت کی اور کہا "یاد رکھو آج تم اس بستی کے مسلمانوں پر جو ظلم کرو گے، کل تمہیں اس کا پھل ضرور ملے گا۔ اس کے بعد انھوں نے غیظ و غضب سے بھرے ہوئے لہجے میں اپنے بیٹے کو یوں مخاطب کیا۔

"بدبخت لڑکے! تم نے میری عمر بھر کی کمائی ہوئی عزت خاک میں ملا دی ہے۔
بستی کے لوگ تمہاری وجہ سے مجھے بھی حقارت سے دیکھتے ہیں۔ تمہارے لیے
بہتری اسی میں ہے کہ تم اسی وقت میرے گھر کو چھوڑ کر چلے جاؤ، ورنہ میں تمہیں
اپنے ہاتھوں سے ختم کر دوں گا۔"

یہ سن کر میں حیران رہ گیا، میرے تصور میں بھی یہ بات نہ آتی تھی کہ اس دور میں کوئی باپ اپنے بیٹے سے محض اپنے عقیدے اور ایمان کی خاطر اتنی نفرت کر سکتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ بوڑھے شخص کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ غصے کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ بیٹے کے پاس باپ کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ میں چاہتا تھا کہ اسے سمجھاؤں اور اس کے والد کا دل نرم کرنے کی کوشش کروں، لیکن مجھے اس کا موقع نہ مل سکا۔ چند منٹ بعد بوڑھا باپ مکان کے اندر گیا اور پھر ایک خنجر اٹھاتے ہوئے تیزی سے واپس ہمارے کمرے میں آگیا۔ واپس پہنچتے ہی اس نے خنجر سے اپنے بیٹے پر حملہ کر دیا۔ نور محمد نے بچنے کی بہت کوشش کی، مگر بوڑھے کے ایک ہی وار نے اسے زمین پر گرا دیا ــــ اس کے بعد باپ

نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دی۔ آنکھ جھپکنے میں نور محمد کا نرخرہ کٹ چکا تھا اور اس کے خون سے کمرے کا قالین سرخ ہو رہا تھا۔ اس منظر نے میری حالت غیر کر دی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ بیٹے کو قتل کرنے والا باپ مجھے بھی نہ چھوڑے گا، لیکن اس نے مجھے قدرے نرم لہجے میں مخاطب کیا۔

"مجھے سچ سچ بتا دو کہ کمیونسٹ پارٹی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

میں نے اپنی جیب سے سورۂ یاسین نکالی اور اسے دکھاتے ہوئے کہا:

"بابا۔ میں اس پارٹی کا ممبر ہوں۔"

یہ سن کر بوڑھے کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ اس نے مجھے گلے سے لگا کر بوسہ دیا اور پھر اپنے کمیونسٹ بیٹے کی لاش کو دیکھے بغیر مجھے ساتھ لے کر گاؤں میں اپنے ایک دوسرے دوست کے ہاں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ میں نے اپنے کافر بیٹے کو قتل کر دیا ہے۔ سب نے بوڑھے مجاہد کو گلے لگا کر مبارکباد دی۔ پھر ان سے میرا تعارف ہوا۔ سب لوگوں نے میرے ساتھ گرمجوشی اور محبت سے مصافحہ اور معانقہ کیا۔ اس کے بعد ان سب نے فیصلہ کیا کہ آج کی رات گاؤں کے تمام خلقیوں اور پرچمیوں کا صفایا کر دیا جائے۔ اس فیصلے کے مطابق کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کو پکڑ کر ایک جگہ پر اکٹھا کر دیا گیا۔ ان میں سے اکثر مقامی مجاہدین کے رشتے دار اور دوست تھے، لیکن انہوں نے کسی کی پروا کیے بغیر سب کو ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے بعد چونکہ یہ سب جانتے تھے کہ اب کمیونسٹ انتقام ضرور لیں گے، لہٰذا گاؤں والوں نے متوقع حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری شروع کر دی۔ مجھے ایک مجاہد کے سپرد کر دیا گیا، تاکہ وہ مجھے بحفاظت کابل پہنچا دے۔

اگلی صبح پو پھٹنے سے کچھ پہلے وہ محافظ مجھے لے کر کابل کی طرف روانہ ہوا۔ جب روشنی ہو گئی، تو ہم دونوں نے ایک اونچی پہاڑی پر ایک غار میں پناہ لی۔ اسی صبح کابل میں گلدرہ کے واقعے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ پارٹی کے اتنے ارکان کی موت پر وہاں کہرام برپا ہو گیا۔ دوپہر

سے پہلے ہی رُوسی کیمونسٹ فوج ٹینک اور توپیں لیے گل درہ آپہنچی۔ میں نے اپنے مجاہد محافظ کے ساتھ پہاڑی کی چوٹی سے یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مجاہدین خاصی دیر تک رُوسیوں کے خلاف ڈٹے رہے، مگر پرانی بندوقوں اور محدود کارتوسوں کے ساتھ وہ کب تک مقابلہ کرتے۔ بالآخر رُوسی ٹینک گاؤں پر چڑھ دوڑے۔ بہت سے لوگوں کے گھروں کی تلاشی لی گئی۔ زبردست لوٹ مار مچی۔ رُوسی گھروں سے سامان نکالتے اور جیپوں اور ٹرکوں میں ڈال کر کابل روانہ ہو جاتے۔ اس کے بعد گاؤں میں لاؤڈ سپیکروں پر اعلان کیا گیا کہ پہاڑوں پر چھپے ہوئے لوگ نیچے اتر آئیں، تو انہیں کچھ نہ کہا جائے گا، ورنہ پُورے گاؤں کو آگ لگا کر بچوں اور عورتوں کو قتل کر دیا جائے گا۔ میرے محافظ نے مجھے کہا، اب ہمیں نیچے جانا ہو گا۔ تم یُوں ظاہر کرتے رہنا، گویا تم گونگے ہو۔ اس کے بعد اس نے مجھے پیٹھ پر لادا اور گاؤں جا پہنچا۔ جب میں اس کے گھر پہنچا، تو دیکھا کہ رُوسی اس کے گھر کا تمام قیمتی سامان لوٹ کر لے گئے ہیں، مگر میرے میزبان پر اس کا کوئی اثر نہ ہُوا۔ اس نے بے نیازانہ انداز سے مجھے دیکھا اور کہا، کوئی پروا نہیں مجھے اپنے وطن کی آزادی و آبرو سے زیادہ اپنا مال عزیز نہیں ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد افغان فوجی دستہ ہمیں بھی پکڑ کر کھلے میدان میں لے گیا جہاں پہلے ہی بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ ان سب لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ کیمونسٹ پارٹی کے لوگ ہم پر بہت ظلم کرتے ہیں، وہ ہمارا مال واسباب لُوٹ کر لے جاتے ہیں، مگر فوجیوں نے ان کی بات سُننے کے بجائے اُلٹا انہیں حکم دیا کہ وہ کیمونسٹوں پر الزام لگانے کے بجائے مجاہدین کو موردِ الزام ٹھہرائیں۔ ایک فوجی افسر ٹیپ ریکارڈر اور مشین گن اُٹھائے ہُوئے میرے میزبان کی طرف بڑھا اور اُسے کہا "تم کہو کہ میرا مال اسباب مجاہدین لُوٹ کر لے گئے ہیں۔ اُنھوں نے ہمارے مویشی مار ڈالے ہیں اور کھیت جلا دیئے ہیں۔" شریف آدمی کو معلوم تھا کہ اگر وہ یہ سب باتیں نہ کہے گا، تو اس کی بہو بیٹیوں کی عزت و آبرو بھی محفوظ نہ رہے گی۔ ناچار اس نے یہ جھوٹا بیان دے دیا۔ اس کے بعد فوجی افسر میری طرف بھی آیا۔ اس نے مجھ سے بھی یہی کچھ کہنے کے

لیے کہا، لیکن میں نے کچھ جواب نہ دیا اور ہائے ہائے کرنے لگا۔ میرے محافظ نے اسے بتایا کہ یہ میرا لڑکا ہے جو گونگا بھی ہے اور بیمار بھی۔ اس طرح میری گلو خلاصی ہوگئی۔ کچھ دیر بعد جب رُوسی اور کارمل سپاہی واپس چلے گئے، تو میرے محسن نے مجھے کھانا کھلایا اور پھر بڑی شفقت سے گاؤں سے کچھ دُور لے جاکر کابل جانے والی بس میں سوار کر دیا۔

دوسرے روز میں نے کابل ریڈیو اور ٹیلی وژن پر گل درہ کے لوگوں کے انٹرویو سُنے اور دیکھے، تو اس میں اس شخص کی باتیں بھی تھیں جس نے مجھے پناہ دی تھی۔

پغمان کے مجاہدین

ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب میں کابل سے پغمان جا رہا تھا۔ ہماری بس کو کابل سے کچھ دُور خواجہ مسافر نامی بستی کے قریب روک لیا گیا۔ ڈرائیور نے ہمیں بتایا، گھبرانے کی ضرورت نہیں، بس روکنے والے ہمارے اپنے مجاہد بھائی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی دو نورانی چہروں والے مجاہد بس میں سوار ہو گئے۔ ادھر دو جوان سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑے تھے۔ اُنھوں نے بس میں سوار تمام مردوں سے ان کے کاغذات طلب کیے۔ صرف دو آدمیوں کے پاس سرکاری پارٹی کی ممبر شپ کے کاغذات تھے۔ مجاہدین نے ان دونوں کو بس سے اُترنے کے لیے کہا۔ ایک اُتر گیا، دوسرا اُترنے لگا، تو اس کی بیوی اور چھ سالہ بچی چلا اُٹھیں۔ اُنھوں نے روتے ہوئے مجاہدین سے کہا "اسے کہاں لے جا رہے ہو۔ ہم کہاں جائیں گے؟" مجاہدین نے اس شخص کو فوراً واپس سیٹ پر بٹھا دیا اور اس کی بیوی سے معذرت کرتے ہوئے کہا "آپ ہماری بہن ہیں۔ آپ کی خاطر ہم اُسے کچھ نہیں کہتے۔ آپ نہ ہوتیں، تو بھی ہم اسے معمولی سی سزا کے بعد چھوڑ دیتے۔ اس لیے کہ ایسے وقت میں جب ہمارے ملک کو مجاہدوں کی ضرورت ہے۔ یہ رُوس کا حامی کیوں بنا ہُوا ہے؟ مگر آپ کی خاطر ہم اسے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔"

اس شخص نے جب مجاہدین کا یہ رویّہ دیکھا، تو اس نے سرکاری شناختی پاس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ وہ ایک فیکٹری کا مزدور تھا اور اس کا نام خیر محمّد تھا۔ وہ اپنے حالات کی وجہ سے مجبور تھا، اس لیے وہ فیکٹری میں پارٹی کی پاکٹ یونین کا ممبر بنا ہوا تھا۔ اس نے بیوی اور بچی کو سمجھایا اور خود مجاہدین کے ساتھ اُتر گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں، تاکہ وہ جہاد میں حصّہ لے کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکے۔ مجاہدین نے اُسے سمجھایا کہ پہلے اپنی بیوی اور بچّی کو گھر چھوڑ آئے، مگر وہ جذبات کی شدّت سے رونے لگا۔ اس نے کہا کہ اب میں گھر نہ جاؤں گا؛ چنانچہ مجاہدین نے اس کو ساتھ لے لیا اور اس کی اہلیہ اور بچی اسی بس میں رہے۔ بعد میں مجاہدین نے خیر محمّد کے خاندان کو بھی محفوظ مقام پر پہنچا دیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے التوا کے بعد ہماری بس روانہ ہو گئی۔

پغمان پہنچ کر میں نے بستی کا ایک صحافیانہ جائزہ لیا۔ میں نے دیکھا بازار کی اکثر دکانیں بند ہیں اور لوگ جوش و جذبے میں نعرے بلند کرتے ہُوئے بازار کا چکّر لگا رہے ہیں۔ جب میں اپنے عزیز کے ہاں پہنچا اور اس سے قصبے کی کیفیت پوچھی، تو اس نے بتایا۔ "آج ہم نے پغمان سے کمیونسٹوں کا صفایا کر دیا ہے۔ کچھ وطن فروشوں کو مجاہدین نے زندہ گرفتار کر لیا ہے اور باقی مارے گئے ہیں۔ اب پغمان کی پُوری وادی مجاہدین کے قبضے میں ہے۔" ابھی میں جس سے باتیں کر رہا تھا کہ مجھے دوسرے کمرے سے کچھ مردانہ آوازیں سنائی دیں، میرے پوچھنے پر اُس نے بتایا کہ یہاں کچھ زخمی مجاہدین کی تیمارداری کی جا رہی ہے۔ کابل کا ایک دواخانہ زخمیوں کے لیے دوائیں اور مرہم پٹّی کا سامان پہنچاتا ہے۔" میری خواہش پر میرا دوست مجھے زخمی غازیوں سے ملانے کے لیے لے گیا۔

وہ دو تھے۔ دونوں شدید زخمی، مگر ان کے چہروں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں خوشی کی نمی تھی۔ ان دونوں کا تعلق حزب اسلامی سے تھا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملائے اور پھر اُن کے نام پوچھے۔ اُن دونوں نے یک زبان ہو کر کہا:

"مرگ" (موت)

مَیں حیران ہُوا، تو انہوں نے کہا "ہم سچ کہہ رہے ہیں۔ ہم رُوسیوں اور وطن فروشوں کی موت ہیں۔ ہم رُوسیوں کی تلاش میں ہیں اور وہ ہمارے آگے بھاگ رہے ہیں۔" اُن کی ایمان افروز باتوں نے میرے سینے میں بھی گرمی پیدا کر دی۔ وہ اپنے زخموں سے بے نیاز تھے اور مجھے بتا رہے تھے کہ ہم نے عزم کر رکھا ہے کہ اسلام کی سربلندی اور وطن کی آزادی کی خاطر اپنی ہر خوشی قربان کر دیں گے۔ اس ملاقات کے بعد مَیں نے اپنے عزیز سے کہا کہ وہ مجھے پغمان کی سیر کرا دے۔ وہ دیر تک مجھے بازاروں، کھیتوں اور باغوں میں گھماتا رہا۔ جگہ جگہ جلے ہُوئے ٹینک پڑے تھے۔ بے شمار تباہ شدہ فوجی گاڑیاں راستوں میں الٹی پڑی تھیں۔ سینکڑوں گھر کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے تھے۔

اسی رات میں واپس کابل پہنچا، تو ریڈیو کابل سے پغمان کی ایک ایسی کہانی نشر کی جا رہی تھی جس نے مجھے حیران کر دیا۔ ریڈیو کابل کہہ رہا تھا:

"آج پغمان کے وطن پرست مسلمانوں نے حکومت کی حمایت میں ایک شاندار جلوس نکالا۔ سینکڑوں افراد نے چوروں اور ڈاکوؤں کے خلاف دفاع کرنے والی تنظیموں میں اپنے نام درج کرائے۔"

تحریکِ اسلامی

افغانستان صدیوں سے مسلمانوں کا دیس رہا ہے۔ اسلام یہاں کے لوگوں کی رگوں میں لہو بن کر دوڑتا رہا، لیکن اس ملک کے عیاش اور بے دین حکمران، لوگوں کو دینی شعور سے بیگانہ بناتے اور جہالت کی ترویج کرتے رہے۔ جہالت بڑھی تو بے حسی میں اضافہ ہُوا۔ دینی قدروں سے محبت کم ہوگئی۔ عوام کا تو کیا ذکر، علماء تک جمود اور غفلت میں گرفتار ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے دینی قدریں پامال ہوتی رہیں، شعائرِ دینی کی بے حرمتی ہُوئی، مگر وہ خوابِ گراں میں سوئے پڑے رہے۔ اس صورتِ حال سے غیر ملکی ملحدانہ نظریات نے فائدہ اٹھایا کمیونزم اسلام کے لبادے میں پیش کیا جانے لگا، اسلام کو مٹانے کی سازشیں کی جانے لگیں، مگر عوام و خواص کی بے حسّی ختم نہ ہوتی۔

اذان کس نے دی؟

مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کی پہلی صدا کابل یونیورسٹی سے اُبھری۔ چند اساتذہ

اور ان کے مٹھی بھر شاگرد اُٹھے۔ انہوں نے جہالت اور غفلت کے سنّاٹوں میں اذان دی۔ یہ کوئی پندرہ برس پہلے کی بات ہے۔ یہ آواز بلند کرنے والے زیادہ مشہور لوگ نہ تھے، اس لیے لوگوں کو تعجب ہُوا۔ ان کی آواز آغاز میں بہت اجنبی محسوس ہُوئی۔ سرکار دربار میں اسے ناپسند کیا گیا، عوام وخواص نے بھی زیادہ توجہ کے قابل نہ سمجھا، لیکن اسلامی تحریک کا چراغ روشن ہُوا، تو پھر دشمنوں کی پھونکیں اسے بجھا نہ سکیں۔ کابل کے حکمران رُوس اور اس کے زرخرید ایجنٹوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ انہوں نے تحریک اسلامی کے سر پھروں کو ظلم ستم کے شکنجوں میں کسا۔ تعذیب وتشدد کا ہر حربہ آزمایا گیا، زہریلے پروپیگنڈے کے تمام تیر چلائے گئے، مقتل گاہیں سجائی گئیں، پھانسی گھر آباد کیے گئے، لیکن اسلام کے پروانوں کا لشکر بڑھتا ہی چلا گیا، یہاں تک کہ ایسا وقت آگیا جب یونیورسٹی میں اسلامی تحریک کے جوانوں کی اکثریت ہو گئی۔ سٹوڈنٹس یونین کے انتخابات میں اسلامی انقلابی نوجوان کامیاب ہو گئے۔ ان کے مظاہروں اور اسلامی انقلاب کے نعروں سے کمیونسٹ گھبرا گئے۔

ماسکو جو کئی برسوں سے کابل میں اپنے اثرات پھیلا رہا تھا، اسلامی تحریک کی بڑھتی ہُوئی قوت سے ہراس میں مبتلا ہو گیا۔ اسے صاف نظر آنے لگا کہ اگر یہی حالت رہی، تو وہ دن دُور نہیں، جب اس کے محنت سے تیار کیے ہُوئے ایجنٹ ختم ہو جائیں گے اور افغانستان میں اسلامی انقلاب آجائے گا؛ چنانچہ ایک فوجی بغاوت کے ذریعے سردار داؤد کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور کامریڈ ترہ کی نے کابل پر اشتراکی پرچم لہرا دیا۔

آزمائش کی بھٹّی

۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء کی سُرخ سازش، اسلامی تحریک کو مٹانے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ رُوسی جانتے تھے کہ اشتراکیت کی مزاحمت اسلام کی فکری تحریک ہی کر سکتی ہے، اس لیے انہوں نے سب سے پہلے اسے مٹانے کی کوشش کی۔ تحریک سے تعلق رکھنے والے ہزاروں

علماء، اساتذہ، دانشور اور طلبہ چُن چُن کر قتل کیے گئے، لیکن شاید خدا کی مشیت یہی تھی کہ اسلام کے نام لیواؤں کو آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر پکایا جائے۔ جتنی آزمائشیں آئیں اُنھوں نے ہنسی خوشی جھیل لیں اور مصائب برداشت کرکے کندن بن گئے۔

افغانستان پر کمیونزم تاریک رات بن کر چھا گیا، تو پریشان حال قوم کو راہِ عمل بتانے کے لیے تحریک اسلامی کے لوگ ہی آگے بڑھے۔ جذبۂ جہاد سے سرشار نوجوانوں نے بستی بستی اور قریہ قریہ پھر کر عوام کو سر پر آئی ہوئی مصیبت کو ٹالنے کی ترکیب سمجھائی۔ پہاڑوں اور وادیوں میں لوگوں کو جمع کیا۔ علماء کو سنگینئ حالات سے آگاہ کیا۔ بستیوں اور قبائل کے عمائدین کو آنے والے طوفان کی تباہ کاریوں سے خبردار کیا۔ اس جدّوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ صدیوں کے خواب گراں میں پڑی ہوئی قوم بیدار ہوگئی۔ علماء اور بزرگوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا، کمیونزم کے خلاف جہاد ہر مسلمان پر فرض ہوگیا ہے۔ اس کے بعد دشت وصحرا "الجہاد الجہاد" کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگے۔

الجہاد الجہاد

جس کے پاس بندوق تھی وہ بندوق لایا، جس کے پاس خنجر تھا۔ وہ خنجر لایا۔ بعض ڈنڈے اور کلہاڑیاں لے کر مجاہدین کے جتھوں میں شامل ہوگئے۔ کچھ لوگوں نے تو بندوقیں خریدنے کے لیے گھر کے اثاثے کو فروخت کردیا۔ بہنوں نے اپنے بھائیوں کو جہاد کے لیے تیار کیا اور ماؤں نے اپنے دل کے ٹکڑوں کو خدا کے دین پر قربان ہونے کے لیے پیش کیا۔ آج کفر والحاد کے خلاف جہاد شروع ہوئے چار برس ہو چکے ہیں۔ دو برس سے تو مجاہدین رُوسی فوج، طیاروں، ٹینکوں اور توپوں سے نبرد آزما ہیں۔ ان چار برسوں میں افغان قوم اپنے دس لاکھ سپوتوں کو آزادی کی راہ میں قربان کرچکی ہے۔ چالیس لاکھ گھروں سے بے گھر ہوکر دوسرے ممالک میں پڑے ہیں، لیکن اب لوگ مرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس قوم نے یہ بات سیکھ لی

کہ جو لوگ مرنے سے نہیں ڈرتے، انہیں حیاتِ جاوداں ملتی ہے۔ اتنی عظیم قربانیاں بھی اسلام کے سچے سپاہیوں کے عزم اور حوصلے کو کمزور نہیں کر پائیں۔ ان کے مورال کو ختم نہیں کر سکیں، بلکہ اس سے اُن کے جذبہ جہاد کو مہمیز ملی ہے۔

رُوس اپنی آہن پوش فوج کے بل پر چاہے کتنی دیر تک اسلامی انقلاب کی راہ روکے رکھے، بالآخر اسے جھکنا پڑے گا۔ افغانوں کے بیکراں جذبوں کے آگے ہمیشہ کے لیے بند باندھنا آسان نہیں۔ جس قوم کے بوڑھے ایسے دیوانے ہوں کہ اپنے کمیونسٹ اور غدار بیٹوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر دیتے ہوں اور جس کے نوجوان ایسے فرزانے ہوں کہ پُرانی اور فرسودہ رائفلوں سے ہیلی کاپٹر مار گراتے ہوں، اسے غلام بنانا آسان کام نہیں ہے۔

مجاہدین کی کامرانیاں

کچھ لوگ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ افغانستان کی جدوجہد آزادی سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، رُوس کبھی واپس نہیں جائے گا، اس لیے سیاسی حل تلاش کرنا چاہیئے، لیکن مجاہدین یہ دیکھتے ہیں کہ گزشتہ چار برسوں کی جدوجہد سے اُنہیں ایسی عظیم کامیابیاں اور فتوحات حاصل ہوئی ہیں، جن سے ان کے دشمن کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ اس کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ جلد یا بدیر اسے جانا ہوگا۔ اس کے مقابلے میں مجاہدین کے حوصلے کئی گُنا بڑھ گئے ہیں۔ انہیں اس بات کا یقین ہے کہ وہ اسلامی انقلاب کی منزل پر پہنچنے والے ہیں۔ سیاسی حل کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو ان کے جہاد کی حقیقت اور ان کے مقاصد سے آگاہ نہیں ہیں۔ مختصراً ان کامیابیوں کی ایک جھلک پیش کی جا رہی ہے جو اب تک کی جدوجُہد سے مجاہدین نے حاصل کی ہیں۔

۱ اس جہاد کے آغاز سے پہلے افغانستان کے عوام کی اجتماعی حالت قابلِ رشک نہ تھی۔ وہ جہالت، عصبیتوں اور جمود کے شکار تھے، مگر جہاد نے ان کی رُوحوں کا زنگ اُتار دیا ہے۔ جہاد کا اعلان ہونے سے پہلے، تو خود مجاہدین کو بھی اندازہ نہ تھا کہ اُن کے نعرہ ہائے تکبیر سے

بے حسی کی قبروں میں پڑے ہوئے مردے بھی جی اٹھیں گے۔ بیداری کا یہ خوش نما منظر دُنیا بھر کی نگاہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔ بالخصوص دُنیا بھر سے تحریک اسلامی کے آنے والے قائدین نے افغانستان کی سرحد پر جا کر افغانوں کی حیاتِ نو کا مشاہدہ کیا ہے۔ اس قوم کا اپنے آپ کو دریافت کر لینا بجائے خود اتنی بڑی کامیابی ہے کہ اس پر ہزار ہ دل فتوحات قربان کی جا سکتی ہیں۔

۲ مجاہدین کی جدّوجہد کا دوسرا خوش آئند پہلو یہ ہے کہ یہ مشتعل اور جھنجھلائے ہوئے لوگوں کا سیلاب نہیں، بلکہ اس کے پس منظر میں منظم اور شعوری جدوجہد کار فرما ہے۔ یہ صرف اپنے ملک کی جغرافیائی سرحدوں کی خاطر نہیں اُٹھے، بلکہ نظریاتی سرحدوں کا تحفظ بھی ان کے پیشِ نظر ہے۔ اس سے پہلے وہ قبائلی اور قومی نوعیت کی جنگیں لڑتے تھے، اب وہ اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر لڑ رہے ہیں۔ ان کے سامنے متفقہ لائحہ عمل یہی ہے کہ ملک کو آزاد کر کے وہاں قرآن وسنّت پر مبنی نظامِ عدل رائج کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں۔ ہم اپنے ملک سے کیمونزم ہی کو مٹا کر خاموش نہ ہو جائیں گے، بلکہ طاغوت کا ہر نشان مٹا کر دم لیں گے۔ ان کے مقاصد میں افغانستان ہی نہیں، پورے عالمِ اسلام میں اسلام کی حقیقی حکمرانی کا قیام شامل ہے۔ ان کی مختلف گوریلا تنظیموں میں طریقِ کار کا اختلاف تو ہے، لیکن اسلام کے سوال پر ان کے درمیان دو رائیں موجود نہیں۔"

۳ ایک کمزور اور بے یارو مددگار قوم کا اتنے طویل عرصے تک ایک سپر طاقت کے سامنے ڈٹے رہنا ایک ایسا کام ہے جس نے دُنیا میں سپر طاقتوں کا افسوں توڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہ اصول ختم ہو گیا ہے کہ دُنیا میں کمزور قومیں صرف دوسروں کی دست نگر بننے کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ اس سے پہلے محکوم قومیں یہ سوچتی تو تھیں کہ کسی طرح بڑی طاقتوں کی غلامی کا حلقہ اپنی گردنوں سے اتار پھینکیں، لیکن کسی میں اس کی ہمّت نہ تھی۔ افغانوں نے ان کے سامنے عزت و آبرو کی مثال پیش کی اور انہیں جدّوجہد کی راہ دکھائی ہے۔ یہی نہیں، اُنہوں نے دُنیا میں ایک عالمی اسلامی انقلاب کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اس بنیاد کو دس لاکھ شہیدوں کے

خون سے لالہ زار بنا یا گیا ہے۔

۴ گزشتہ چار برس کی جدوجہد نے افغانستان کو دو لاکھ کے قریب ایسی تربیت یافتہ فوج مہیا کی ہے جو گوریلا طرزِ جنگ کی ماہر اور خدا کی راہ میں کٹ مرنے کے جذبے سے سرشار ہے۔ ان لوگوں نے سنگلاخ دروں اور وادیوں میں گوریلا طرزِ جنگ کی ایسی بے مثال تربیت حاصل کی ہے کہ وہ رُوس کی باقاعدہ فوج سے کہیں زیادہ مؤثر ہیں۔ اس قوت کی موجودگی میں آئندہ کسی ملک کو افغانستان پر میڑھی نگاہ ڈالنے کا حوصلہ نہیں ہو گا۔ یہ لاکھوں سپاہی مستقبل میں عالمِ اسلام اور اسلامی تحریکوں کے لیے بھی سامان تقویت بنیں گے۔

۵ افغان مجاہدین نے مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں، اور دُنیا بھر میں مسلم اقلیتوں کے لیے فکر و عمل کی نئی جوت جگائی ہے۔ اگر ایک نادار قوم اپنے لیے کئی ہزار گنا بڑی قوت کے ساتھ چار برس تک جنگ لڑ سکتی ہے، تو آخر کیا وجہ ہے کہ وسائل سے مالا مال عرب ملک مجتمع ہو کر اسرائیل کی حقیر طاقت کو خاک میں نہ ملا سکیں۔

۶ افغانستان کے جہاد نے مجاہدین کو سب سے بڑا فائدہ یہ پہنچایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے ایمان و یقین میں اضافے کے لیے ان کو غیبی مدد اور نصرت سے نوازا ہے۔ قرآنِ پاک میں مومنین سے وعدہ فرمایا گیا ہے کہ "اگر تم میں سے بیس آدمی صابر ہوں، تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں، تو منکرینِ حق میں سے ہزار آدمیوں پر بھاری رہیں گے۔"

افغان مجاہدین نے اپنی آنکھوں سے اس خدائی وعدے کو ایفا ہوتے دیکھا ہے۔ مجاہدین کو سینکڑوں معرکوں میں اس کا مشاہدہ ہو چکا ہے، جب وہ تعداد میں اپنے سے دس گنا دشمن پر غالب آگئے۔ ایک معروف عالمِ دین اور مجاہد نے جہاد کے دوران اپنے مشاہدات کے حوالے سے بتایا:

"ہم نے اپنی آنکھوں سے میدانِ جہاد میں ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ انسانی عقل جن کی توجیہہ نہیں کر سکتی۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہؓ کے ساتھ

خداوندِ تعالیٰ نے جو عنایات میدانِ بدر میں فرمائی تھیں۔ ہم گناہگاروں نے کئی بار اُن کا مشاہدہ کیا ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے جہاد کے دَوران ہماری نصرت کے لیے آسمان سے فرشتوں کی باقاعدہ ٹولیاں اترتی ہیں ___ کئی بار ہم دشمن کی زد میں ہوتے ہیں یا اس کے مکمل گھیرے میں آجاتے ہیں یا وہ بمباری کرکے ہمارے ٹھکانوں کو تباہ کر دیتا ہے، مگر ہم محفوظ رہتے ہیں، دشمن ہمیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔"

اتحاد ناگزیر ہے

افغان مجاہدین کی کوئی کمزوری اگر ہے، تو اُن کے درمیان عدمِ اتحاد ہے۔ اس وقت ان کے دس کے قریب گروہ مختلف محاذوں پر مصروفِ جہاد ہیں۔ اگرچہ اُنہوں نے جہاد کو مؤثر بنانے کے لیے اتحاد و یک جہتی کی ضرورت کئی بار محسوس کی ہے۔ بار بار اتحاد قائم بھی ہوئے لیکن پھر ٹوٹ گئے۔ حال ہی میں سات جماعتوں کے مابین "اتحاد اسلامی مجاہدینِ افغانستان" کے نام سے نیا اتحاد وجود میں آیا ہے۔ اس میں وہی جماعتیں شامل ہیں جو اصل قوت کی مالک ہیں اور جو ماضی میں کسی نہ کسی حیثیت میں اسلامی تحریک سے متعلق رہی ہیں۔ بالفاظِ دیگر، وہ سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اور ان کے درمیان فکری ہم آہنگی موجود ہے۔ حالات نے ان کو الگ الگ ٹکڑیوں میں بانٹ دیا تھا، لیکن وہ سبھی یہ محسوس کرتے تھے کہ ان سب کو ایک ہی پرچم تلے جمع ہونا چاہیے، کیونکہ ان کا افتراق دشمن کے لیے سامانِ تقویت ہے۔ خدا کرے کہ ان کا نیا اتحاد ان کی ماضی کی غلطیوں کی تلافی کا سامان کر دے۔

جہاں تک دشمن کے خلاف جہاد کا سوال ہے، مجاہدین کے درمیان مکمل اتحاد موجود ہے۔ وہ مورچوں میں ساتھ بیٹھ کر لڑتے ہیں۔ ایک صوبے کے مجاہدین کی قوت دوسرے صوبے کے کام آتی ہے اور ایک قبیلے کے مجاہد دوسرے قبیلے کے ساتھ مل کر جہاد کرتے

ہیں ۔اس لیے وہ دن دُور نہیں۔ جب وہ ہر میدان میں ایک دوسرے سے پیوستہ اور متحد ہو جائیں گے، پھر ان کی کامیابی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے گی۔ اس کے بعد ان کی کامیابی زیادہ فاصلے پر نہ رہے گی۔ ان کے اتحاد کا مطلب باطل کی شکست ہوگا۔ پھر وہ دو گام چل کر اسلامی انقلاب کی منزل کو پالیں گے۔

افغانستان کے ہمسائے

پاکستان کا مثالی کردار

افغانستان پر رُوسی حملے کے بعد مہاجرین کا جو سیلاب شروع ہُوا، ابھی اُس کا سلسلہ جاری ہے۔ صرف پاکستان میں مہاجرین کی تعداد ۲۵ لاکھ سے زیادہ ہو چکی ہے۔ کسی ترقی پذیر ہمسائے کے لیے دُوسرے ملک کے اتنے مہانوں کو خوش آمدید کہنا بڑے دل گُردے کی بات ہے۔ پاکستان کے معاشی وسائل اور اقتصادی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے، مگر پاکستان کی حکومت اور عوام نے مہاجرین کو کُھلے دل سے قبول کر کے ایک تاریخی مثال قائم کی۔ حکومتِ پاکستان نے علی الاعلان کہا کہ وہ اپنے قریبی ہمسایے اور اسلامی مُلک کے باشندوں کو وحشیانہ بمباری کے سامنے بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتی۔ جب تک ان کے ملک پر غیر مُلکی قبضہ باقی رہے گا، جان و آبرو کو خطرہ ہو گا، پاکستان ان کے لیے پناہ گاہ بنا رہے گا۔

اگر ہم تاریخی حقائق کے حوالے سے اس مسئلے پر غور کریں، تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ماضی کی افغان حکومتوں نے سیاسی وُجوہ کی بنا پر پاکستان سے کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ مدتوں افغانستان کے حکمرانوں نے غیر ملکی اشاروں پر پاکستان کے خلاف پروپیگنڈا کیا اور پاکستان کے ایک حصّے پر اپنا حق جتاتے رہے۔ انہوں نے نام نہاد پختونستان کا سٹنٹ کھڑا کر کے پاکستان سے سرد جنگ چھیڑی اور پاکستان کے کچھ لوگوں کو زہریلے پروپیگنڈے کے ذریعے اپنے ملک کی نظریاتی اور جغرافیائی حدُود کے خلاف اُکسایا۔ یہ الگ بات ہے کہ نہ تو پاکستان کے عوام پر اس پروپیگنڈے کا کچھ اثر ہُوا، نہ افغان عوام ہی نے اس کا کچھ اثر لیا۔ ان حقائق کے علی الرغم پاکستان کا فراخدلانہ رویّہ اور مصیبت میں اپنے بھائیوں کے کام آنا عالی ظرفی کا ثبوت ہے۔ پاکستان کے اس رویّے نے افغان عوام کے دل موہ لیے ہیں اور اب انہیں افغانستان کی طرح پاکستان بھی محبوب ہے۔ ہر افغان کی سوچ اب یہ ہوگئی ہے کہ خدانخواستہ اگر پاکستان کبھی کسی خطرے میں پڑا تو وہ اس کی حفاظت کے لیے اپنا لہُو بہانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔

قابلِ تعریف تحمّل

بین الاقوامی طور پر پاکستان نے مہاجرین کو قبول کر کے ایک بہت بڑا چیلنج قبول کیا ہے۔ شدید معاشی بوجھ کے علاوہ اسے رُوس اور اُس کے اتحادی ممالک کی سیاسی ناراضگی کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ کریملن اور کابل کے ذرائع ابلاغ پاکستان کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کے لیے وقف ہو چکے ہیں۔ بڑے تسلسل کے ساتھ یہ جھوٹ دُہرایا جا رہا ہے کہ پاکستان افغان مجاہدین کی پُشت پناہی کر رہا ہے، انہیں اسلحہ مہیّا کر رہا ہے اور پاکستانی سرزمین پر مجاہدین کو فوجی تربیت دی جا رہی ہے۔ ریڈیو کابل اور رُوسی خبر رساں ادارے واویلا مچا رہے ہیں کہ پاکستان، امریکہ، چین، ایران اور دوسرے مُسلم

ممالک کے مسلح فوجی افغانستان میں مداخلت کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس بے بنیاد پروپیگنڈے کے اثرات بہت معمولی ہوئے ہیں، لیکن اس بات کو بہانہ بنا کر پاکستان کی سرحدوں کی بار بار خلاف ورزی کی جا رہی ہے۔ کئی بار رُوسی ساخت کے طیارے پاکستانی سرحدوں کے اندر گھس کر گولے برسا چکے ہیں، جس سے متعدد پاکستانی فوجی اور بے گناہ شہری شہید اور زخمی ہوئے ہیں اور املاک کو نقصان پہنچا ہے۔

ان حملوں کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان مشتعل ہو کر افغانستان کو اس کا جواب دے، تا کہ رُوس کو پاکستان پر حملہ کرنے کا بہانہ ہاتھ آئے۔ اب تک پاکستان نے سرحدی خلاف ورزیوں اور اشتعال انگیزیوں کے جواب میں قابلِ تعریف تحمّل کا مظاہرہ کیا ہے۔

فراہمیٔ اسلحہ کا الزام

جہاں تک رُوس اور اُس کے ایجنٹوں کے اس الزام کا تعلق ہے کہ پاکستان مجاہدین کو اسلحہ فراہم کر رہا ہے، اس کی تردید خود افغانستان کی تاریخ سے ہو جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کی تاریخ غیر ملکی جارحیت کے خلاف مزاحمت سے عبارت ہے۔ صدیوں سے افغان عوام اپنے دشمنوں کے خلاف ملک کے اندر اور باہر برسرِ پیکار رہے ہیں۔ حالات نے انہیں یہ سبق سکھایا ہے کہ ان کے ہر بچے اور بوڑھے، مرد اور عورت کو سپاہی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہر افغان اپنے بچے کو پیدائش کے فوراً بعد بندوق سے مانوس کرتا ہے۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی اسلحہ کے استعمال اور جنگی حکمتِ عملی سے آگاہ ہوتی ہیں اور وقت پڑنے پر بندوق چلا سکتی ہیں۔

۱۹۷۸ء میں ترہ کی کے اقتدار میں آنے تک ہر افغان گھرانے میں اسلحہ موجود تھا اور اس کے استعمال پر کوئی پابندی نہ تھی۔ قدیم و جدید ہتھیاروں کے لائسنس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ملک بھر میں مردوں کے لیے عسکری تربیت حاصل کرنا ضروری تھا۔ قانون کے

تحت ۱۲ سال کی عمر میں ہر شخص کو لازمی فوجی خدمت انجام دینے کے لیے فوج میں بھرتی ہونا پڑتا تھا۔ ناخواندہ افراد دو برس، ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کرنے والے ایک برس اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ چھ ماہ تک باقاعدہ فوجی تربیت حاصل کرتے تھے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ افغانستان کا ہر جوان اور بوڑھا شخص تربیت یافتہ سپاہی ہے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس حقیقت کی روشنی میں دیکھا جائے تو کسی افغان کے پاس بندوق کا ہونا ہرگز یہ ثابت نہیں کرتا کہ اس نے یہ بیرونی ملک سے حاصل کی ہے۔ بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ افغان اچھی رائفل حاصل کرنے کے لیے ہمیشہ مشتاق رہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ بعض اوقات گھر کا اثاثہ تک فروخت کر دیتے ہیں۔ جس ملک میں اچھا نشانہ باز ہونا سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہو، جہاں بندوق چلانا مردوں کی شجاعت اور عورتوں کے حسن کی علامت خیال کیا جاتا ہو، وہاں گھروں پر چھاپے مار کر بندوقیں برآمد کرنا اور اسے بنیاد بنا کر الزام عائد کرنا کہ یہ پاکستان اور امریکہ کا دیا ہوا ہے، حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔

چالیس لاکھ مہاجرین

گزشتہ چالیس برس سے یہ پروپیگنڈا بھی کیا جا رہا ہے کہ افغان مہاجرین پاکستان کی "سازش کی وجہ سے فرار ہو کر پاکستان جاتے ہیں اور جب انہیں "حقیقت" کا علم ہو جاتا ہے تو واپس افغانستان چلے آتے ہیں۔ ریڈیو کابل آئے دن اس قسم کی خبریں نشر کرتا ہے کہ آج اتنے افغان مہاجرین پاکستان سے واپس آگئے۔ آج اتنے ایران سے لوٹ آئے۔ اگر اب تک کے اعلانات کے مطابق حساب لگایا جائے تو پاکستان میں کوئی مہاجر باقی نہیں رہتا۔ لیکن اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ہر روز ایک ہزار سے زیادہ افراد افغانستان کی سرحد عبور کر کے پاکستان آ رہے ہیں اور گزشتہ چار برس کے عرصے میں چالیس لاکھ افراد ملک چھوڑ کر پاکستان، ایران اور دوسرے ملکوں میں

پناہ لے چکے ہیں۔ ہجرت کر کے آنے والا کوئی مہاجر گنبہ واپس نہیں گیا۔ جو لوگ رُوسی مظالم سے تنگ آ کر، لُٹ پٹ کر، اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو اشتراکیت کی بھینٹ چڑھا کر یہاں آئے ہیں، وہ اشتراکیت کے چنگل میں پھنسے ہُوئے خُوں ریز خطّے میں واپس کیونکر جا سکتے ہیں۔ پاکستان میں تو انہیں پناہ ملی ہے۔ یہاں ان کے ایمان و ناموس کو تحفّظ ملا ہے۔ پاکستان کی حکومت اور عوام نے ان کے زخموں پر پھاہا رکھا ہے۔

پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے کا مقصد یہ تھا کہ افغان عوام کو پاکستان سے متنفّر کر کے مزید لوگوں کو ہجرت سے باز رکھا جا سکے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ بستیوں پر بمباری اور لُوٹ مار کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ افغانوں کے دلوں میں پاکستان سے نفرت پیدا کرنے اور اُنہیں اس کے خلاف اکسانے کی تمام تدبیریں اب ناکام ہو چکی ہیں۔ گزشتہ دَور کے زہریلے پروپیگنڈے کے اثرات زائل ہو چکے ہیں۔ یہاں آ کر افغانوں نے دیکھا ہے کہ پاکستان نے انہیں صرف بین الاقوامی طے شدہ اصُولوں کے تحت ہی خوش آمدید نہیں کہا بلکہ ان کی مدد اور نصرت کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھا ہے۔
پاکستانی اُس اسلامی حکم کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہیں کہ جب کوئی اسلامی گروہ کسی جگہ سے ہجرت پر مجبور ہو جائے تو دُوسرے مسلمانوں پر اس کی مدد فرض ہو جاتی ہے۔

کابل ریڈیو یہ پروپیگنڈا ابھی کر رہا ہے کہ افغانستان میں امن و امان قائم ہو چکا ہے، اس لیے مہاجرین کو واپس آ جانا چاہیے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ "امن و امان" کے باوجود کابل ریڈیو سے ہر روز کرفیو کے اوقات کا اعلان بھی کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ رات دن بے گناہ شہریوں پر بمباری کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ جو لوگ شہری علاقوں کو چھوڑ کر پہاڑوں پہ پناہ گزین ہوتے ہیں، اُن کا وہاں بھی تعاقب کیا جاتا ہے۔ ایسے

ماحول میں بوڑھوں، بچّوں اور عورتوں کے لیے ہجرت کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ پاکستان قریبی ہمسایہ ہونے اور ایک اسلامی ملک ہونے کی وجہ سے مہاجرین کی مہمان نوازی کرنے پر مجبور ہے۔ وہ بے گناہ لوگوں کو جنگ کی بھڑکتی ہوئی آگ کا ایندھن بننے کے لیے افغانستان میں واپس نہیں دھکیل سکتا۔ اسی لیے پاکستان کے صدر جنرل محمد ضیاءُالحق اور دُوسرے حُکّام نے غیر مُبہم الفاظ میں کئی بار اپنی پالیسی کا اعادہ کرتے ہُوئے کہا ہے کہ جب تک افغانستان کے موجودہ حالات تبدیل نہیں ہوتے، غیر ملکی فوجیں وہاں سے واپس نہیں جاتیں، پاکستان مہاجرین کو ان کے ملک میں واپس جانے پر مجبُور نہیں کرے گا۔ جب ظلم کی سیاہی چھٹ جائے گی تو مہاجرین آبرومندانہ طریقے سے واپس جائیں گے۔ پاکستان نے انہیں بوجھ اور مصیبت سمجھ کر قبول نہیں کیا بلکہ اپنا ٹوٹا ہُوا اور زخمی بازو جان کر گلے لگایا ہے۔

پاکستان کی حکومت کے ساتھ ساتھ پاکستان کے مَرد و زن مسلمان عوام بھی افغان بھائیوں کے معاملے میں مثالی کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس ملک کے غیوّر لوگوں نے افغانستان کے خانماں برباد مہاجرین کو نہایت محبّت سے گلے لگایا ہے۔ اور اُن کو اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اس سلسلے میں یہاں کی تحریکِ اسلامی کی کارکردگی قابلِ ستائش ہے۔ اس تحریک کے کارکنوں نے اپنے شب و روز زخم خوردہ افغان بھائیوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیے ہیں اور ان کا دُکھ درد بانٹنے میں مصروف ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستانی مسلمان اور خصوصاً اس تحریک کے کارکُن افغانستان کے لُٹے پُٹے بے آسرا مہاجرین کے لیے انصار بن گئے ہیں۔ اور بڑے خلوص اور لگن سے اپنے اسلامی فریضے سے عُہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تحریک کے کارکنوں نے ملک بھر میں جگہ جگہ افغان مہاجرین کی امداد کے لیے ادارے قائم کر رکھے ہیں جو مہاجرین کی ہر قسم کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ کئی فلاحی

اداروں کا قیام عمل میں لایا گیا ہے، جس میں پشاور میں افغان سرجیکل ہسپتال اور متعدد دوسرے طبی یونٹ اور امدادی مراکز شامل ہیں۔ ان مراکز میں سات سو کے قریب ہمہ وقتی رضاکار اور کارکن مہاجرین کی فلاح کا خیال رکھتے، علاج معالجہ کرتے اور مشکلات حل کرتے ہیں۔ اس طرح افغان مہاجرین کا یہ احساس بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے کہ وہ کسی غیر ملک میں آئے ہوئے ہیں۔

ایران

افغانستان کے دوسرے قریبی ہمسائے اور برادر اسلامی ملک ایران نے بھی مہاجرین کی گرانقدر خدمت انجام دی اور مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس نے افغانستان پر روسی جارحیت کی سخت الفاظ میں مذمت کی، بلکہ لاکھوں مصیبت زدہ بھائیوں کو پناہ دی۔ اگرچہ ایران میں مہاجرین کی تعداد سات لاکھ کے قریب ہے لیکن ایسے وقت میں جب ایران کو واقعی مشکلات اور بیرونی جنگوں کا سامنا ہے یہ تعداد بھی کچھ کم نہیں۔ مقام افسوس ہے کہ کسی عالمی تنظیم یا ملک نے ایران کی مالی مشکلات کا اندازہ نہیں لگایا اور افغان مہاجرین کے لیے ایران کو مدد نہیں دی۔

ایرانی قیادت بار بار روس کو خبردار کرتے ہوئے مطالبہ کر چکی ہے کہ وہ افغانستان سے فی الفور اپنی فوجیں نکال لے، ورنہ اس کے حق میں بہتر نہ ہوگا۔ امام خمینی نے افغانستان پر روسی حملے کو ایران پر حملے کے مترادف قرار دیتے ہوئے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا:

"ایران افغان مجاہدین کو ہر ممکن امداد دے گا"

اسلام آباد میں ہونے والی اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں ایرانی وفد نے افغان مجاہدین کے نمائندوں کو اپنے وفد میں شامل کر کے خطاب کا موقع دیا، چنانچہ مجاہدین کے نمائندے پروفیسر برہان الدین ربانی نے کانفرنس میں افغانوں کی طرف

سے پہلی تقریر کی۔

رُوس نے ابتدا میں ایران کے خلاف پروپیگنڈے سے احتراز کیا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ ایران امریکہ کے سخت خلاف ہے اس لیے رُوس کے نرم رویّے سے وہ اس کا دوست بن جائے گا۔ مگر ایران کی انقلابی قیادت نے رُوس کی چالوں میں آنے کے بجائے افغان مجاہدین کی حمایت کی اور مہاجرین کی اعانت کا سلسلہ جاری رکھا۔ رُوسی جارحیّت کا ایک سال ہونے پر تہران میں افغان مہاجرین نے احتجاجی مظاہرہ کیا اور اس مظاہرے کے دوران انہوں نے رُوسی سفارت خانے پر حملہ کر کے رُوسی پرچم نذرِ آتش کر دیا۔ اس پر رُوس نے ایران سے احتجاج کیا۔ اس کے جواب میں ایرانی حکومت نے کہا:

"اگر رُوس افغان عوام پر ظلم و تشدّد نہ کرتا، تو افغان اس کے سفارت خانے پر کبھی حملہ نہ کرتے۔"

بھارت

گزشتہ رُبع صدی کے دوران افغانستان اور بھارت کے درمیان ہمیشہ دوستی رہی ہے۔ لیکن دوستی کا پتہ اُس وقت چلتا ہے جب ایک دوست پر کوئی مصیبت آئے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت نے دیرینہ دوستی کا کوئی خیال نہ رکھا۔ بھارتی حکومت کی موجودہ پالیسی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ظاہر شاہ اور داؤد کے دَور میں جب وہ افغان عوام کی دوستی کا دم بھرتی تھی، تو اس کا اصل مقصد افغانوں کو پاکستان کے خلاف اکسا کر اپنا اُلّو سیدھا کرنا تھا۔ بھارت نے عبدالغفّار خان کو بھاری رقموں کی تھیلیاں پیش کیں، تاکہ وہ پشتونستان کا نام نہاد سٹنٹ زندہ رکھ کر بھارت کو تقویت پہنچا سکیں۔ بعینہٖ اسی طرح بھارت نے ہمیشہ افغان حکمرانوں کی پیٹھ ٹھونکی تاکہ پاکستان سے ان کے تعلقات

کشیدہ رہیں۔ نام نہاد مسئلہ پشتونستان کے لیے جب کابل میں ایک مستقل وزارت قائم ہوئی تو بھارت نے اس مقصد کے لیے بھی رقوم کا بھاری "عطیہ" دیا۔ افغانستان جوں جوں بھارت کے قریب جاتا رہا، پاکستان سے اس کے تعلقات خراب ہوتے رہے۔

بھارتی عوام کی اکثریت اپنی حکومتوں کے برعکس افغانوں کی حقیقی بہی خواہ تھی اور ہے۔ رُوس نے افغانستان پر مسلح حملہ کیا تو عوامی طبقوں کے دباؤ میں آکر جنتا حکومت نے اس کی مذمّت کی۔ انتخابات جیتنے کے لیے مسز گاندھی نے بھی اپنی یہی پالیسی رکھی۔ اُنہوں نے کئی بار اپنی تقاریر میں رُوسیوں کی مداخلت کی مخالفت کی، لیکن ۱۹۸۰ء کے انتخابات میں کامیابی کے بعد مسز گاندھی نے سیاسی رُخ تبدیل کرلیا۔ اس دن سے بھارت رُوس کی فوجی کارروائی کو جائز قرار دے رہا ہے۔ بینُ الاقوامی سطح پر بھی بھارتی حکومت رُوس کی ہمنوائی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ اس پالیسی نے افغانوں کو ان کے "بھارتی دوستوں" کی اصل تصویر دکھا دی ہے اور دنیا بھر میں بھارتی ساکھ مجروح ہوئی ہے۔

جن دِنوں کابل میں رُوسی فوج کی مداخلت کی پہلی سالگرہ منائی جارہی تھی، نئی دہلی میں افغان مہاجرین نے رُوسی اور افغان سفارت خانوں کے سامنے مظاہرے کیے۔ بھارتی پولیس نے مظاہرین پر ڈنڈے برسائے۔ اس کے بعد جب رُوسی صدر برزنیف بھارت آئے، تو بھارت میں افغان باشندوں کی نقل وحرکت پر پابندی عاید کر دی گئی۔ ایسے موقع پر افغان باشندوں پر لاٹھی چارج بھی کیا گیا اور بہت سے افغانوں کو جیل بھیج دیا گیا۔

دوسری طرف بھارتی عوام اور رائے عامہ کے لیڈروں کی اکثریّت افغان عوام کے ساتھ اپنی ہمدردی کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ جلسے، جلوسوں اور مظاہروں کے ذریعے بھارتی حکومت کی رُوس نوازی کی پالیسی کو مسترد کیا جارہا ہے۔ بھارتی پریس

کے ایک مُوثّر حصّے نے افغان عوام پر جبر و تشدّد کی کُھل کر مذمت کی ہے اور بھارت کے دس کروڑ مسلمانوں نے تَن مَن دَھن کے ساتھ افغان مجاہدین کی حمایت کا اعلان کیا ہے ۔ البتّہ بھارتی کمیونسٹوں کی قلیل تعداد رُوس کے حق میں شب و روز پروپیگنڈا کرتی رہتی ہے اور سرکاری اخبارات بھی اندرا گاندھی کی ہاں میں ہاں ملاتے دکھائی دیتے ہیں ۔ یہ لوگ وہی بات کرتے ہیں جو رُوسی اُن کے مُنہ میں ڈالتے ہیں ، اس لیے کہ رُوسی امداد پر ان کا گزارہ ہے ۔

عوامی جمہوریہ چین

چین اور افغانستان میں دوستی کے رشتے داؤد حکومت کے زمانے میں استوار ہُوئے تھے ۔ افغانستان پر رُوسی اُفتاد پڑی تو چین نے اس کا بھرپور ساتھ دیا اور حقِ دوستی ادا کیا ۔ اس سے پہلے سردار داؤد کے زمانے میں چین کی مدد سے پروان میں آب پاشی کا بہت بڑا منصوبہ مکمّل ہُوا ۔ قندھار میں دو سو بستروں کا ہسپتال ، کابل میں بگرامی ٹیکسٹائل ملز اور دُوسرے کئی پراجیکٹ چینی کوششوں اور امداد سے بنائے گئے ۔ ترہ کی انتظامیہ نے آتے ہی چین کے خلاف پروپیگنڈے کا آغاز کر دیا ۔ اس پہ الزام لگایا گیا کہ وہ مجاہدین کی امداد کرتا ہے ، مگر اس سفید جھُوٹ کا ثبوت ابھی تک پیش نہیں کیا جا سکا ۔

افغانستان کو چین سے ملانے واخان کی تنگ پٹی پر رُوسی قبضے کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہاں سے چین کی مداخلت کا امکان ختم ہو جائے ۔ چین اگر چاہتا تو اپنی سرحد سے ملنے والے صُوبے بدخشان میں آسانی سے مداخلت کر سکتا تھا ۔ وہاں افغان گوریلوں کو ہر قسم کی امداد دی جا سکتی تھی ، لیکن نہ تو اُس نے ایسا کیا اور نہ رُوسیوں نے کبھی کہا کہ وہاں چینی مداخلت کر رہے ہیں ۔ افغانستان کے دُوسرے صوبوں میں گڑبڑ ہوتی

ہے تو امریکہ اور پاکستان کے ساتھ چین کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے ، لیکن بدخشاں میں
مجاہدین کی سرگرمیاں کا الزام لگاتے وقت صرف پاکستان اور امریکہ کا ذکر کیا جاتا
ہے ۔ سوال یہ ہے کہ اگر چین اپنی سرحد پہ واقع علاقے سے مجاہدین کو مدد نہیں دیتا تو
پاکستانی اور ایرانی علاقوں سے کیوں کر مدد دیتا ہے ؟

اَقوامِ عالَم اور عالَمِ اسلام کا رَدِّ عمل

افغانستان پر رُوسی لشکر کشی کی خبر ملتے ہی پُوری دُنیا میں اس کی مذمّت کی گئی ۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۷۹ء کو امریکہ کے صدر کارٹر نے اسے کُھلی جارحیّت قرار دیا اور عالمی امن کے لیے شدید خطرے سے تعبیر کیا ۔ امریکی صدر نے اسی روز صدرِ پاکستان جنرل محمّد ضیاءُ الحق سے ٹیلی فون پر تبادلۂ خیال کیا ۔ ۳۱ر دسمبر کو چین کی طرف سے شدید ردِّ عمل کا اظہار کیا گیا ۔ چینی حکومت نے رُوس کے مسلح حملے کی شدید مذمّت کرتے ہُوئے مداخلت کار فوج کی فوری واپسی کا مطالبہ کیا ۔ لندن میں امریکہ ، برطانیہ ، مغربی جرمنی ، فرانس ، اٹلی اور کینیڈا کے نمائندوں نے ایک ہنگامی اجلاس میں افغانستان پر رُوسی جارحیّت سے پیدا شدہ صُورتِ حال پر غور کیا اور متّفقہ طور پر اس کی مذمّت کی ۔ اسی روز امریکی وزیرِ خارجہ نے پاکستان کے ساتھ اپنے ۱۹۵۹ء کے معاہدے کے حوالے سے رُوس کو خبردار کیا اور کہا :

"امریکہ ، پاکستان پر رُوسی حملے کی صُورت میں اپنی تمام تر ذمّہ داریاں پُوری کرے گا ۔"

رُوس کو دعوت کس نے دی؟

رُوس نے چار روز کی مکمل خاموشی کے بعد یکم جنوری ۱۹۸۰ء کو اپنے مجرمانہ اقدام کا جواز پیش کیا۔ رُوسی اعلان میں کہا گیا:

"رُوسی فوج افغان حکومت کی دعوت پر بھیجی گئی ہے اور جوں ہی افغانستان میں غیر ملکی سازشیں ختم ہو جائیں گی اسے واپس بلا لیا جائے گا۔"

یہ عجیب دعوت تھی کہ جس میں "دعوت" دینے والے (حفیظ اللہ امین) کو قتل کرنے کے بعد اس کی دعوت قبول کی گئی۔ کوئی ایسا بیوقوف شخص بھی ہو سکتا ہے جو اپنے قاتلوں کو دعوت دیتا ہو کہ آؤ مجھے قتل کر دو اور میری حکومت پر قبضہ کر لو۔

رُوس کے اس اعلان نے ثابت کر دیا کہ چار دن کے توقّف کے باوجود اسے کوئی بہانہ ہاتھ نہ آسکا۔ اصل بات ماننا اس کے لیے ممکن نہ تھا جو یہ تھی کہ افغانستان میں حالات اس کے ایجنٹوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے اور مجاہدین کی بڑھتی ہوئی مزاحمت کو روکنا کابل کی کمیونسٹ انتظامیہ کے بس میں نہ رہا تھا۔ رُوسی فوج اسی مزاحمت کو ختم کرنے آئی تھی۔ مگر اس حقیقت کو تسلیم کر لینے سے جھوٹ کا پُورا قلعہ منہدم ہو جاتا تھا، اس لیے ماسکو نے "دعوت" کا بہانہ گھڑ لیا۔

یہ درست ہے کہ ۱۹۷۸ء میں ترہ کی نے ماسکو میں ایک فوجی معاہدے پر دستخط کیے تھے۔ اگر اس معاہدے کی رُو سے رُوس کو فوج اُتارنے کی اجازت حاصل ہو گئی تھی، تب بھی اس بات کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی، کیونکہ ترہ کی عوام کا نمائندہ نہ تھا۔ اس کی کٹھ پتلی حکومت ایک دن کے لیے بھی مستحکم نہ ہو سکی تھی اور عوام الناس کی اکثریت نے اس کے خلاف ہتھیار اُٹھا لیے تھے، کیونکہ وہ ملک و قوم کو رُوس کے ہاتھ بیچنا چاہتا تھا۔ بحث کی خاطر ایک لمحے کے لیے اس غیر نمائندہ شخص کے دستخطوں سے ہونے والے معاہدے کو تسلیم کر لیا جائے، تو

بھی اس دستاویز میں کوئی ایسی شق موجود نہ تھی جس میں کہا گیا ہو کہ ضرورت پڑنے پر رُوس کابل میں اپنی فوج اُتار سکے گا۔ اس ضمن میں اگر کوئی خُفیہ معاہدہ ہوا تھا تو اُس کی نقل افغان وزارتِ خارجہ میں ضرور ہوتی۔ اگر ایسا ہوتا تو رُوسی یقیناً دُنیا کو اس سے باخبر کرتے، مگر اس دعوت کے ثبوت میں ایک سطر بھی پیش نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ رُوسی اس قسم کے حیلے بہانوں سے ہمسایہ ملکوں کو قبضے میں لیتے چلے آئے ہیں اور انہیں آئندہ بھی اس کا موقع ملا تو دریغ نہ کریں گے۔

بھارت۔ پہلے حمایت پھر مخالفت

۴ جنوری ۱۹۸۰ء کو تینتالیس ایشیائی اور افریقی ممالک نے سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس طلب کیا۔ کونسل کے اجلاس میں بھارت کے وزیرِ خارجہ چرن سنگھ نے رُوسی حملے کو بھارت اور عالمی امن کے لیے خطرہ قرار دیا۔ پاکستان نے رُوسی فوج کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ رُوس کے نمائندے نے چین، امریکہ اور دُوسرے یورپی ملکوں پر اعتراض کیا اور کہا:

"وہ افغانستان کے انقلاب کو ناکام بنانے کے لیے سازشیں کر رہے ہیں۔ ہم افغان حکومت کی دعوت پر آئے ہیں۔" اس کے ساتھ ہی رُوسی مندوب تروبانسکی اجلاس سے واک آؤٹ کر گیا۔

۵ جنوری کو صدر کارٹر نے رُوس کو اناج اور ٹیکنالوجی کی فراہمی بند کرنے کا اعلان کیا اور ۸ جنوری کو سلامتی کونسل میں غیر جانب دار ممالک کی طرف سے رُوسی جارحیت کے خلاف قرارداد کا مسودہ پیش ہُوا۔ سلامتی کونسل کے ۱۱ ارکان نے قرارداد کے حق میں ووٹ دیے۔ افغان نمائندے شاہ محمد دوست نے اس کی مخالفت کی اور رُوس نے اسے ویٹو کر دیا۔ قرارداد میں رُوسی فوجوں کی غیر مشروط واپسی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

اسی روز بھارت میں انتخابات ہو رہے تھے۔ مسز گاندھی کی پارٹی کانگرس (آئی) کا پلڑا بھاری تھا۔ اندرا گاندھی نے مسئلۂ افغانستان کو بھی ایک انتخابی ہتھیار کے طور پہ استعمال کیا۔ اندرا کانگرس کے مقررین نے ایسے بیانات دیے جس میں رُوسی حملے کو بھارت اور پُورے منطقے کے لیے خطرہ قرار دیا، مگر جونہی کانگرس (آئی) کے جیتنے کی خبر عام ہُوئی اندرا گاندھی اپنے سابقہ بیانات سے منحرف ہوگئیں۔

جنرل اسمبلی کی قرارداد

رُوس کے ویٹو کے بعد افریشیائی ممالک نے اقوامِ متّحدہ کی جنرل اسمبلی کا اجلاس طلب کرلیا۔ ۱۱ر جنوری کو اسلامی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری جناب حبیب شطّی نے اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کا اجلاس طلب کیا۔ اُدھر جنرل اسمبلی کے ہنگامی اجلاس میں پاکستان کے وزیرِ خارجہ جناب آغا شاہی نے مطالبہ کیا کہ افغانستان سے رُوسی فوجیں فوراً واپس بلائی جائیں اور اقوامِ متّحدہ کے ذریعے افغانستان میں آزاد اور خود مختار حکومت قائم کی جائے۔

ابھی جنرل اسمبلی کا اجلاس جاری تھا کہ بھارت میں اندرا گاندھی انتخاب جیت کر وزیرِ اعظم بن گئیں اور پہلے بیانات سے انحراف کرتے ہُوئے روسی اقدام کی حمایت شروع کر دی۔ ۱۵ر جنوری کو جنرل اسمبلی نے اپنے اجلاس میں ۱۰۴ ووٹوں کی بھاری اکثریّت سے رُوسی حملے کی مذمّت کی۔ قرارداد کے خلاف صرف ۱۸ ووٹ پڑے۔ بھارت نے ووٹ نہیں دیا۔

۲۲ر جنوری کو ایران نے رُوس سے اپنا ۵۸ سالہ معاہدہ یک طرفہ طور پر ختم کر دیا، تاکہ وہ کسی وقت اس معاہدے کی آڑ لے کر ایران میں فوج نہ اُتار دے۔ ۲۸ر جنوری کو اسلام آباد میں اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ کے اجلاس میں رُوسی فوج کی فی الفور

واپسی کا مطالبہ کیا گیا۔ ایک قرارداد میں رُوسی جارحیّت کی مذمت کی گئی اور رُوسی فوجی جارحیّت کو اقوامِ مُتّحدہ کے منشور کی صریح خلاف ورزی قرار دیا گیا۔ اسلامی ممالک کے وزرائے خارجہ نے متفقہ طور پر کئی فیصلے کیے جن کی رُو سے طے پایا کہ ببرک کارمل کی انتظامیہ کو تسلیم نہ کیا جائے، ماسکو اولمپکس کا بائیکاٹ کیا جائے، افغان مہاجرین کی امداد کے لیے فنڈ قائم کیا جائے اور خطرے کے وقت پاکستان کی امداد کی جائے۔

یکم فروری کو نیویارک میں افغانستان پر رُوسی حملے سے پیدا شُدہ صُورتِ حال پر غور کرنے کے لیے غیر جانبدار ممالک کا اجلاس بلایا گیا۔ اِدھر اسلامی کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ افغان مجاہدین کو اسلامی کانفرنس میں بطور مبصّر نمائندگی دی جائے گی۔ اُدھر امریکی صدر کے قومی سلامتی کے مشیر برزنسکی پاکستان آئے۔ اُنھوں نے صدرِ پاکستان سے افغانستان کی صُورتِ حال پر مذاکرات کیے۔ اس کے علاوہ وہ افغان مہاجرین کے کیمپوں میں گئے اور ان کو امریکہ کی بھرپور حمایت و امداد کا یقین دلایا۔

یکم مارچ کو برطانیہ نے رُوس سے مطالبہ کیا کہ وہ افغانستان سے اپنی فوجیں نکال لے اور اس کی غیر جانب دارحیثیّت کی بین الاقوامی طور پر ضمانت دی جائے۔ ۷ر مارچ کو افغان مجاہدین کی تنظیموں کی طرف سے اقوامِ مُتّحدہ کے جنرل سیکرٹری کرٹ والڈہائم کے نام ایک یادداشت بھیجی گئی جس میں بتایا گیا کہ رُوس افغانستان کے نہتّے عوام پر زہریلی گیس کے بم برسا رہا ہے۔ ۲ر اپریل کو برطانوی وزیرِ خارجہ نے تصدیق کی کہ رُوس افغانستان کے دیہی علاقوں پر کیمیائی بم برسا رہا ہے۔

۴ر اپریل کو ایرانی قائد امام خمینی نے صدر برزنیف کو ایک پیغام بھیجا جس میں خبردار کیا گیا کہ رُوس طاقت کے ذریعے اسلامی ممالک کی آزادی کو پامال کرنے کی کوشش ترک کر دے۔ دوسری طرف ایران کے صدر بنی صدر نے اعلان کیا کہ ضرورت پڑنے پر ایران افغان مجاہدین کو اسلحہ بھی فراہم کرے گا۔

۵ اپریل کو کریملن سے ایک بیان جاری کیا گیا کہ رُوس اور کابل انتظامیہ نے ایک مشترکہ معاہدے پر دستخط کیے ہیں جس کے ذریعے دونوں حکومتوں نے افغانستان میں رُوسی فوج کے قیام کی ضرورت کی توثیق کی ہے۔

اِسلامی وُزرائے خارجہ کا دُوسرا اجلاس

۱۷ مئی کو اسلام آباد میں اسلامی وزرائے خارجہ کا دُوسرا اجلاس ہُوا۔ اس میں افغانستان کو شمولیت کی اجازت نہ دی گئی۔ اسلامی ممالک نے ایک قرارداد کے ذریعے رُوس کی فوج کشی کی سخت الفاظ میں مذمّت کی اور اس مطالبے کا اعادہ کیا گیا کہ رُوس فی الفور اپنی فوجیں واپس بلالے۔ ماسکو اولمپکس کے بائیکاٹ کے فیصلے کی دوبارہ توثیق کی گئی۔ اسلامی ممالک کی طرف سے مصالحتی کمیٹی بھی قائم کی گئی۔ طے پایا کہ کارمل سے محض ایک پارٹی لیڈر کی حیثیت سے کسی دوسرے ملک میں بات چیت کی جائے گی۔ اِدھر کابل کی کٹھ پُتلی انتظامیہ نے رُوس کے اشارے پر بیان جاری کیا کہ ہم پاکستان اور ایران سے مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ بیان بھی جاری ہُوا کہ اسلامی ممالک افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں۔

ماسکو اولمپکس کی ناکامی

۱۹۸۰ء میں ماسکو میں منعقد ہونے والے اولمپک کھیل ناکام ہُوئے۔ ان میں سوائے کمیونسٹ اور رُوسی حلقۂ اثر کے ممالک کے کسی نے شرکت نہ کی۔ دُنیا کے آزاد اور غیر جانب دار ممالک کی مشہور ٹیمیں شریک نہ ہونے سے اولمپک مقابلوں کی اہمیت ختم ہو کر رہ گئی۔ خود افغانستان سے بھی بہت کم ٹیمیں ان مقابلوں میں شریک ہوئیں، کیونکہ ہاکی ٹیم کے کچھ کمیونسٹ ارکان کو کُندز میں مجاہدین نے قتل کر دیا تھا اور فٹ بال، رَیسلنگ اور

باسکٹ بال کی ٹیمیں ملک چھوڑ کر مجاہدین سے جا ملی ہیں۔ جن ممالک نے ماسکو اولمپکس میں شرکت کا فیصلہ کیا اُن میں سے بھی اکثر نے افتتاحی اور اختتامی تقریبات کا بائیکاٹ کیا۔ بائیکاٹ کرنے والوں میں یوگوسلاویہ، فرانس، برطانیہ، رومانیہ اور شمالی کوریا بھی شامل تھے۔

سخاروف کا کلمۂ حق

آندرے سخاروف پہلی رُوسی شخصیت تھے جنہوں نے رُوس میں رہتے ہوئے افغانستان پر برزنیف کی مسلح جارحیّت کی مخالفت کی۔ انہوں نے افغانستان پر رُوسی حملے کو حقوقِ انسانی کی کُھلم کُھلا خلاف ورزی قرار دیا اور نہتّے افغانوں پر ہونے والے مظالم اور بربرّیت کی شدید الفاظ میں مذمّت کی۔ سخاروف وہ شخص تھے جنہوں نے رُوس کے لیے مہلک ایٹم بم بنایا تھا۔ انہیں رُوس میں ہیرو کا مقام حاصل رہا ہے۔ ایسے شخص کا احتجاج بے وزن نہ تھا۔ ملک بھر میں ان کی آواز سُنی گئی اور خاموش زبانوں کے قفل ٹوٹنے لگے۔ سخاروف نے سچ بول کر اپنے آپ کو شدید آزمائشوں میں مبتلا کر لیا۔ آج وہ اسی "جرم" کی سزا میں گورکی کے شہر میں نظربندی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

نیویارک میں پاکستانی اور رُوسی وزرائے خارجہ کے مابین مذاکرات ہوئے۔ اس گفتگو کی روشنی میں اسلامی کانفرنس نے مصالحتی کمیٹی کے ارکان کی تعداد تین سے بڑھا کر پانچ کر دی۔ سفارتی کوششوں کا آغاز ہوا۔ مصالحتی کمیٹی کے کئی اجلاس ہوئے مگر یہ کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ رُوسی کسی ایسی دلیل کو جانتے ہیں نہ مانتے ہیں جو الفاظ سے بنی ہو۔ وہ تو صرف گولی کی دلیل سمجھتے ہیں اور یہ دلیل افغان مجاہدین کے پاس ہے۔

مغربی ممالک کا ردِّعمل

مغربی ممالک نے میڈرڈ کانفرنس میں رُوسی جارحیّت کی شدید الفاظ میں مذمّت

کی۔ کانفرنس میں برطانوی مندوب نے کہا:

" افغانستان میں انسانی حقوق پامال ہو رہے ہیں اور یہ بات مشرق و مغرب کے تعلقات کی بہتری میں سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے"۔

رُوس کے نائب وزیرِ خارجہ نے کہا:

" یہ مسئلہ صرف رُوس اور افغانستان ہی حل کر سکتے ہیں"۔

ہالینڈ کے نمائندے نے کہا:

"رُوس کی کارروائی سے سلامتی اور تعاون کو شدید نقصان پہنچا ہے" ہالینڈ کے نمائندے نے یہ بھی کہا" انسانی حقوق کی خلاف ورزی ایک ایسا معاملہ ہے کہ اس پر بحث و تنقید کسی ملک کا اندرُونی معاملہ قرار نہیں دیا جا سکتا"۔

یہ بات رُوسی مندوب کے اُس اعتراض کا جواب دیتے ہُوئے کہی گئی کہ کانفرنس میں شامل ممالک افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کر رہے ہیں اور کانفرنس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یورپی مشترکہ منڈی نے افغانستان میں انسانی حقوق پامال کرنے پر رُوس کی سخت مذمت کی۔ لکسمبرگ کے مندوب نے یورپی سلامتی کانفرنس میں تقریر کرتے ہُوئے رُوس کی فوجی کارروائی کو ۱۹۷۵ء کے معاہدۂ ہلسنکی کی خلاف ورزی قرار دیا۔ امریکی وفد کے سربراہ نے رُوس کو سخت الفاظ میں خبردار کرتے ہُوئے کہا:

" جب تک رُوس افغانستان سے اپنی فوجیں واپس نہ بلائے گا، صُلح جوئی اور دیتانت کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی"۔

امریکہ نے مطالبہ کیا کہ رُوس اپنی فوج فوراً واپس بلائے اور افغان عوام کے حقوق پامال کرنے سے باز آجائے، لیکن تمام مطالبات کے جواب میں رُوس نے "میں نہ مانوں" کی تکرار جاری رکھی۔ رُوس کے منفی رویّے نے ثابت کر دیا کہ وہ "جس کی لاٹھی

اُس کی بجینس" کے اصول پر یقین رکھتا ہے اور کسی ضابطے کا پابند نہیں۔ وہ اقوامِ متحدہ کے منشور کو تسلیم کرتا ہے نہ اسے اقوامِ عالم کی قراردادوں اور مطالبات کی کچھ پرواہ ہے۔

جنرل اسمبلی کی دُوسری قرارداد

نومبر ۱۹۸۰ء میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کا پینتیسواں اجلاس شروع ہوا۔ اس میں دُوسرے مسائل پر بات چیت کے علاوہ غیر جانب دار ممالک کی طرف سے پیش کی گئی اس قرارداد پر بھی مفصل بات چیت ہوئی جس میں افغانستان سے رُوسی فوجوں کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس مرتبہ پاکستان کی تیار کردہ اس قرارداد کے حق میں ۱۱۱ ووٹ آئے۔ مخالفت میں ۲۲ ووٹ پڑے جو رُوس اور اس کے حواریوں کے تھے۔ رُوس کے نمائندے نے افغانستان کی صورتِ حال پر بحث کرنے کو اس کے اندرونی معاملات میں مداخلت قرار دیا اور کہا:

"رُوسی فوج کی افغانستان میں موجودگی ایشیائی ممالک کی علاقائی یکجہتی اور قومی آزادی کی ضمانت ہے اور رُوسی فوجی کارروائی کی ذمہ داری سامراجیت توسیع پسند اور رجعت پسند عناصر پر عائد ہوتی ہے۔"

کابل کی کٹھ پتلی حکومت کے وزیرِ خارجہ شاہ محمد دوست نے بھی رُوسی مندوب کی ہاں میں ہاں ملائی اور افغانستان کے مسئلے پر بحث کو افغانستان کی خُود مختاری کے منافی قرار دیا۔

جنرل اسمبلی نے ایک اور قرارداد کے ذریعے اقوامِ متحدہ کے جنرل سیکرٹری سے کہا کہ وہ افغانستان کا بُحران ختم کرنے کے لیے اپنا نمائندہ مقرر کریں جو ماسکو، تہران، کابل اور اسلام آباد کا دورہ کرے اور اس طرح مذاکرات کے ذریعے رُوسی فوجوں کی واپسی کی راہ ہموار کی جائے۔ برطانیہ نے بھی پیشکش کی کہ افغانستان کی آزاد اور غیر جانب دار

حیثیت بحال کرنے کے لیے یورپی مشترکہ منڈی کے ممالک ہر ممکن تعاون کریں گے اور اس سلسلے میں سیاسی مذاکرات کے ذریعے راہ ہموار کی جائے گی۔ کچھ عرصے تک یہ تجویز سفارتی حلقوں کے درمیان سفر کرتی رہی، لیکن بالآخر رُوس اور اُس کی پٹھو حکومت نے بیک زبان اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ یہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت ہے۔

دنیا کے ضمیر کا سوال

دنیا بھر میں انسانی حقوق کے علمبرداروں نے کارمل انتظامیہ کو خبردار کیا ہے کہ وہ انسانی حقوق کو پامال نہ کرے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے بھی اسے ایک یادداشت بھیجی ہے۔ اس سے پہلے ترہ کی دور میں ریڈکراس کا ایک وفد افغانستان کی جیلوں کے معائنے کے لیے بھیجا گیا تھا، لیکن اس کے آنے سے پہلے جیل خانے خالی کر دیے گئے تھے۔ قیدی ایسے گھروں میں منتقل کر دیے گئے جنہیں حکومت نے تو میا لیا تھا۔ اس لیے وفد ناکام واپس چلا گیا۔ اس وفد کے ارکان کو اس سوال کا جواب کسی نے نہ دیا کہ اگر جیلوں میں کوئی قیدی موجود نہیں تو ہزاروں علماء، اساتذہ، ڈاکٹر، انجینئر، سیاستدان اور دانشور کہاں گئے؟ دیہی علاقوں سے گرفتار کیے گئے وہ ہزاروں مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے کہاں ہیں جنہیں گرفتار کر کے جیلوں میں بھیجا گیا تھا؟

بین الاقوامی برادری نے بار بار یہ سوالات پوچھے، مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ دُنیا کے ضمیر نے چیخ چیخ کر رُوس کو شرم دلائی کہ وہ معصوم اور بے گناہ لوگوں کو بمباری اور زہریلی گیسوں کا نشانہ نہ بنائے مگر اُس کے کان پر جُوں تک نہ رینگی حالانکہ وہ اور اُس کے یہی حواری مُلک، ویتنام میں امریکی بمباری پر پُوری دنیا میں شور مچایا کرتے تھے۔ اسی طرح جب اسرائیل نے فلسطینی آبادیوں پر حملہ کیا تو رُوس اور اُس کے حواری احتجاج کرنے

والوں کی پہلی صف میں موجود تھے۔ مگر افغانستان میں جب انہوں نے سینکڑوں بستیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا اور لاکھوں افراد کو شہید کر دیا تو انسانی حقوق کے تمام دعوے طاقِ نسیاں میں دھرے رہ گئے۔

جب ہرات شہر کی تیس ہزار آبادی کو ایک ہفتے کے دوران شہید کر دیا گیا، جب بغلان کی ایک بستی میں ۵۰۰ افراد کو زندہ دفن کر دیا گیا، جب ہزارہ جات اور بغلان میں مردم کشی کی بدترین مثالیں پیش کی گئیں، جب گنر اور پروان کی وادی پنج شیر میں زہریلی گیسوں کا بے دریغ استعمال کیا گیا اور دنیا بھر سے احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں تو روس نے اس کا جواب تک نہ دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ممالک صرف احتجاج اور مذمت تک محدود رہے، شاید کسی میں جارح کا گریبان پکڑنے کا حوصلہ اور ہمت نہیں ہے۔ اقوامِ عالم اپنی اپنی جگہ پُرامن رہنا چاہتی ہیں، لیکن وہ بڑی طاقتوں کے غصے سے بھی ڈرتی ہیں اور اسی خوف نے نام نہاد سپر طاقتوں کو ظلم اور ناانصافی پہ دلیر کیا ہے۔

دنیا بھر کے باضمیر لوگ افغانستان کی صورتِ حال سے ناخوش ہیں۔ وہ سب روس پر پھٹکار بھیج رہے ہیں، یہاں تک کہ کمیونسٹ اور مارکسسٹ ممالک نے بھی روسی جارحیت کی مذمت کی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ بھی روس کی جارحیت کو ختم کرنے کے لیے کافی نہیں۔ روس کو افغانستان سے نکالنے کے لیے فیصلہ کن کردار خود افغان مجاہدین کو ادا کرنا ہوگا۔ وہ اس کے لیے تیار بھی ہیں۔ ہزاروں صف شکن مجاہد روسیوں کے دانت کھٹے کرنے کے لیے میدانِ جہاد میں اُترے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت ان کے شاملِ حال ہے اور مورخ کا قلم ان کا منتظر۔

عالمِ اسلام کا ردِ عمل

۲۷ دسمبر ۱۹۷۹ء کے واقعے نے پوری دنیا کی طرح عالمِ اسلام کو بھی ہلا ڈالا۔

مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اسلامی ممالک نے روسی جارحیت کی مذمت کی۔ اکثر اسلامی ممالک نے افغانستان پر حملے کو عالم اسلام پر حملہ قرار دیا۔ بین الاقوامی اداروں میں اسلامی ممالک کے نمائندوں نے پُرجوش تقریریں کیں۔ اسلامی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی احتجاج کی صدائیں بلند ہوئیں۔ لیکن اس سے افغانستان کی ستم رسیدہ قوم کے دکھوں کا مداوا نہ ہو سکا، نہ ہو سکتا تھا۔

بعض مسلمان ملکوں نے جن میں پاکستان اور ایران قابلِ ذکر ہیں، مجاہدین اور مہاجرین کی اشک شوئی کا کچھ اہتمام کیا۔ لیکن مجموعی طور پر عالم اسلام کا کردار مایوس کن رہا۔ بات قرار دادوں سے آگے نہیں بڑھی۔ یا پھر پاکستان کے مہاجرین کے کیمپوں کے دوروں کے بعد تسلی و تشفی کے کچھ کلمات ادا کیے گئے۔ افغان عوام کو ٹھوس امداد کی اشد ضرورت تھی۔ جذبۂ اخوتِ اسلامی کی بندھائی ہوئی اُمیدوں کے برعکس وہ عالم اسلام نے بہم نہ پہنچائی۔

بات دراصل یہ ہے کہ عالم اسلام اس وقت دو بڑی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا اکھاڑا بنا ہُوا ہے۔ کچھ ممالک نے امریکہ کی بالادستی تسلیم کر رکھی ہے۔ تو باقی رُوس کے خوشہ چین ہیں۔ کیا یہ بدقسمتی کی بات نہیں کہ بعض ایسے اسلامی ممالک بھی تھے جنہوں نے افغان عوام کے خلاف رُوسی جارحیت کی حمایت کی اور رُوس کے حق میں ووٹ دیا۔ یا غیر جانب دار رہے۔ ورنہ اگر تمام مسلم ممالک کی رائے ایک ہوتی اور وہ متفقہ لائحہ عمل اختیار کرتے تو نہ رُوس افغانستان کے مسئلے پر ہٹ دھرمی کی روش برقرار رکھ سکتا، نہ اسرائیل اور امریکہ فلسطین کے مسئلے پر اپنی ضد قائم رکھ سکتے۔

شروع شروع میں امریکہ اور چین کے علاوہ بعض اسلامی ممالک نے بھی اعلان کیا تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر افغان مجاہدین کو اسلحہ کی امداد بھی دیں گے، مگر اب جبکہ مجاہدین کو اسلحہ کی ضرورت ہے تو سب خاموش بیٹھے ہیں۔ جن ممالک نے رُوس کے خلاف

اقتصادی پابندیوں کا اعلان کیا تھا ۔ وہ بھی نئی مصلحتوں کے تحت اپنی سابقہ پالیسی سے انحراف کر رہے ہیں۔ لے دے کر اب مسلم ممالک اور دُوسری اقوامِ عالم یہ آس لگائے بیٹھی ہیں کہ رُوس بالآخر مذاکرات پر راضی ہو جائے گا اور مسئلہ افغانستان کا کوئی پُرامن حل تلاش کر لیا جائے گا۔ لیکن یہ محض مفروضہ ہے۔ رُوس کی تاریخ گواہ ہے کہ اُس نے کبھی پُرامن حل کو تسلیم نہیں کیا۔ بالفرض خرابیٔ بسیار کے بعد ایسا ہو بھی جائے تو کیا دُنیا اُس وقت تک افغانوں کے قتل و غارت کا تماشا دیکھتی رہے گی۔

کیا عالمِ اسلام کے حکمرانوں کے لیے یہ بات باعثِ انضطراب نہیں کہ رُوس افغانوں کی نسل کُشی کر رہا ہے۔ اور چند برسوں میں دس لاکھ سے زیادہ لوگ شہید کیے جا چکے ہیں اور چالیس لاکھ سے زیادہ ملک سے ہجرت کر گئے ہیں۔ یعنی افغانستان کی ۴ فیصد آبادی گزشتہ چار برسوں میں ختم ہو گئی ہے۔ قتل و غارت اگر اسی رفتار سے جاری رہا تو آئندہ چار برس میں افغانستان کی نصف آبادی ختم کی جا سکتی ہے۔ اگر یہ خدشات بے بنیاد نہیں تو مسلم ممالک کے قائدین کو سوچنا چاہیے کہ اس وقت ان کی ذمہ داری کیا ہے! صرف قراردادوں اور احتجاجوں سے کام نہ بنے گا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ افغان قوم خود ان کی بقا کی جنگ لڑ رہی ہے۔ خدانخواستہ یہ حصار ٹوٹ گیا تو پھر ان کا دامن دشمن سے دُور نہ رہے گا۔

استعماری طاقتیں اور افغانستان

روس اور امریکہ کو اسلحہ اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے دُنیا میں جو برتری حاصل ہے، اس کی بنا پر یہ دونوں طاقتیں باقی ملکوں کو اپنا مطیع بنانے کی فکر میں ہیں تاہم دونوں کے درمیان طریقِ کار کا اختلاف موجود ہے۔ روس دوسروں کو مغلوب کرنے کی خاطر دُنیا کے مُروجہ اصولوں اور قوانین کی مطلق پروا نہیں کرتا جب کہ امریکہ بظاہر اپنے ارادے اور عمل کو اصول اور قانون کا جامہ پہناتا ہے۔ وہ اپنے سامراجی منصوبوں کی تکمیل کے لیے براہ راست ملوّث ہونے سے گریز کرتا اور اکثر دوسروں کی آڑ میں واردات کرتا ہے۔ لیکن اس حقیقت میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ دونوں بڑی طاقتیں اپنے اپنے سامراجی عزائم رکھتی ہیں اور دُنیا کو ان سے کسی خیر کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔

رُوس

۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد رُوس کی تاریخ ایک استعماری سفر کی خونیں داستان

معلوم ہوتی ہے۔ اشتراکیت کی بنیادیں مستحکم ہوتے ہی لینن اور اس کے ساتھیوں نے دُنیا کی تسخیر کے صدیوں پُرانے خواب کو جامۂ حقیقت پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔ سب سے پہلا پروگرام یہ بنا کہ ملک کے قریبی پڑوسیوں کو اشتراکیت کی تبلیغ کی جائے۔ اس غرض کے لیے وسیع فنڈ مقرر کیے گئے۔ بھاری رقوم خرچ کر کے قریبی ملکوں میں ایجنٹ خریدے گئے۔ پھر ان ایجنٹوں کے ذریعے شورشیں اور بغاوتیں برپا کر کے ان ملکوں کا امن و امان تباہ کیا گیا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی ریاستوں کو ہڑپ کرتے ہوئے رُوسی سرحد دریائے آموں (جیحوں) تک پہنچا دی گئی۔

دماغوں پر قبضہ

دُوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر کی فوجیں رُوس پر حملے کے دوران برفستان میں پھنس کر تباہ ہو گئیں اور اتحادی طاقتیں مغرب میں جرمنی کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تو رُوس اور اتحادیوں نے جرمنی کو آپس میں بانٹ لیا۔ مشرقی جرمنی رُوس کے حصے میں آیا۔ اس کے ساتھ ہی رُوس نے مشرقی جرمنی کی تمام دولت، اس کے سائنس دان، انجینئر اور دانش ور ماسکو منتقل کر دیے۔ اسی طرح کا عمل بلغاریہ، پولینڈ، ہنگری اور دوسرے مفتوحہ علاقوں میں بھی دُہرایا گیا۔ آج کے رُوس کی سائنسی، صنعتی اور دُوسرے شعبوں میں ترقّی تمام تر انہی درآمد شدہ ماہرین کی مرہونِ منّت ہے۔ یہ انسانی دماغوں پر قبضے کی عجیب ترین ڈکیتی ہے۔ جن علاقوں پر رُوس نے قبضہ کیا، اُنہیں رُوسی بنانے کے لیے وہاں کی آبادی کا ایک حصہ وہاں سے نکال کر سائبیریا کے منجمد صحراؤں میں دھکیل دیا اور وہاں رُوسی کمیونسٹوں کو لا کر بسا دیا۔

پرایا مال اپنا

نو آبادیاتی عمل کو جاری رکھنے اور اپنی اقتصادی حالت کو ترقّی دینے کے لیے

روسی حکمرانوں نے مقبوضہ علاقوں کی دولت دونوں ہاتھوں سے لُوٹی۔ وہ جس ملک میں گئے، وہاں کے تمام زرعی، معدنی اور صنعتی وسائل کو انتہائی ارزاں قیمتوں پر رُوس منتقل کیا اور اس کے بدلے میں دوسرے ممالک سے سستی چیزیں خرید کر ان کے ہاتھوں مہنگے داموں فروخت کر دیں۔ اس طرح مقبوضہ ممالک رُوس کے ساتھ اقتصادی بندھنوں میں بندھتے چلے گئے۔ مثال کے طور پر روس مشرقی جرمنی کی مصنوعات پر ساختہ رُوس (MADE IN RUSSIA) لکھوا کر اُن کمیونسٹ ممالک میں مہنگے داموں فروخت کرتا ہے۔ جہاں یا تو ان چیزوں کی مانگ ہوتی ہے، یا نہیں ہوتی تو زبردستی پیدا کی جاتی ہے۔ کیوبا سے سستے داموں چینی خریدی جاتی ہے اور دوسرے حلیف ممالک کو وہی چینی کئی گنا زیادہ قیمت پر فروخت کی جاتی ہے۔ آج اگر یورپ، ایشیا اور افریقہ میں رُوسی حلقۂ اثر میں گرفتار ممالک اس کی غلامی سے آزاد ہو جائیں، تو رُوس قلاش ہو جائے گا۔

رُوس، پولینڈ کو اپنے قبضے سے نکلنے سے روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ اپنے ملک کی بنیادی ضروریات کے لیے پولینڈ کی مصنوعات کا محتاج ہے۔ اسی طرح افغانستان پر قبضے کی کوششوں کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ یہاں کے وسائل سے اِستفادہ کرنا چاہتا ہے۔

ملکوں کی تجارت

جن ممالک میں آزادی ہے اور تحریر و تقریر اور اظہارِ رائے پر کوئی پابندی نہیں، رُوس وہاں اپنے پروپیگنڈے کا جادُو جگاتا ہے۔ ان ممالک میں ابلاغِ عامہ کے ذرائع کو استعمال کر کے عوام کو کمیونزم سے متأثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ دلآویز کتابوں اور جرائد میں کمیونزم کو خوبصورت نعروں اور دلفریب خوابوں کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی روپے پیسے کی ریل پیل کی جاتی ہے۔ کچھ بکاؤ اور کچھ

سادہ لوح لوگ اشتراکیت کے دام میں پھنس جاتے ہیں۔ یہی لوگ آگے چل کر اپنے ممالک کو رُوس کے پاس فروخت کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں رُوس اور دُوسرے کمیونسٹ ممالک میں آزادیٔ فکر یا آزادیٔ اظہار نام کی کسی چیز کا وجود نہیں۔ ان ملکوں میں شخصی آزادی کا تذکرہ صرف آئین کی جلدوں میں ملتا ہے۔ کسی شخص کو اپنے جائز حقوق کے لیے زبان ہلانے کی بھی اجازت نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو سوشلسٹ ممالک میں اپوزیشن پارٹیوں کا وجود ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر ان ممالک میں مخالف پارٹیوں کے قیام کی اجازت دے دی جائے، تو دُنیا سے سوشلزم کا نام ہی مٹ جائے۔

زہریلا لٹریچر

رُوس کا تیار کردہ لٹریچر رنگ برنگی کتابوں اور رسالوں کی شکل میں دنیا بھر میں پھیلایا جا رہا ہے۔ اس میں بظاہر بہت دلکش بڑی من موہنی باتیں کی جاتی ہیں۔ غریب ممالک کے باشندوں کو دُنیا میں "جنت" کا مژدہ سُنایا جاتا ہے۔ رُوسی سفارت خانے اور "کے جی بی" کے ایجنٹ ان ممالک کے سادہ لوح نوجوانوں کو ایسے سبز باغ دکھاتے ہیں کہ وہ اس کے افسوں میں گرفتار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے دنیا کے اکثر ترقّی پذیر ممالک اپنے عوام کی معاشی حالت سنوار کر عام لوگوں کی مایوسی اور اضطراب ختم کرنے کی کوئی مثبت کوشش نہیں کرتے۔ رُوسی شکاری ایسے مایوس اور مضطرب لوگوں کو زیادہ آسانی سے اسیرِ دام کر لیتے ہیں۔

بیمار ماحول

یہ بات اور بھی افسوسناک ہے کہ مسلم ممالک میں عوام کو اسلام جیسے نظامِ رحمت کی برکات سے آگاہ کرنے کا انتظام نہیں ہے۔ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے معاشرے سے غیر اسلامی ناانصافی ختم ہو، لیکن بیشتر حکمران اپنی خود غرضیوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ وہ اسلام کا دعویٰ تو

کرتے ہیں، لیکن اس کے زرّیں اصولوں کو اپنا کر معاشرے کی اصلاح نہیں کرتے۔ اگر ایسا ہو جائے تو کسی شخص کے دل میں کمیونزم جیسے فاسد نظریے کا خیال تک نہ آئے۔ مگر ان ممالک میں نوجوانوں کی رُوحانی تربیت کا مؤثر انتظام نہیں ہے اور اکثر لوگ نہیں جانتے کہ اسلام کمیونزم کے مقابلے میں زیادہ ترقی پسندانہ نظام ہے۔ اسی وجہ سے اسلامی معاشروں میں سوشلزم جیسی وبا پھیل رہی ہے۔

کمیونزم کی تشہیر کے لیے رُوس کے اربابِ اقتدار ترقّی پذیر ممالک کے بیمار معاشی ماحول کو بہت زرخیز سمجھتے ہیں۔ وہ ایسے تنخواہ دار ملازم رکھتے ہیں جنہیں تخریبی کاموں کے بدلے میں بھاری معاوضے ملتے ہیں۔ ان پر عیش و عشرت کے دروازے کُھل جاتے ہیں۔ اور ان کی ذمّہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ قومی وحدت میں رخنہ انداز ہوں، بنکوں کو لوٹیں اور بعض اہم شخصیتوں کو قتل کر ڈالیں۔ بسا اوقات یہ لوگ رُوس کے اشارے پر اپنی پارٹی کے لوگوں کو بھی گولی کا نشانہ بنا دیتے ہیں۔ پھر اس قتل کی ذمّہ داری حکومت پہ عائد کر دی جاتی ہے۔ پروپیگنڈے کے ذریعے اس ملک کی حکومت کو ظالم اور نا اہل قرار دیا جاتا ہے۔

بغاوت کا ڈھونگ

سول حکومت کے ملازمین کو خریدا جاتا ہے اور فوج میں ایجنٹ بھرتی کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ اس ملک کے خزانے سے بھی تنخواہیں وصول کرتے ہیں اور رُوسی جاسُوسی اداروں سے بھی وظائف حاصل کرتے ہیں۔ یہ رُوسی ایجنٹ ہر طبقے کے لوگوں میں بے چینی پھیلاتے ہیں۔ لوگوں کو قانون شکنی اور سول حکومت کے خلاف بغاوت پر اکسایا جاتا ہے۔ اس طرح کی فضا میں فوجی بغاوت کا جواز پیدا ہو جاتا ہے۔ بغاوت رُوس کی مدد سے ہوتی ہے۔ اس لیے فوج میں اس کے ایجنٹ ملک کے اقتدار پر قبضہ کرتے ہیں۔ پھر رُوس اپنی پُوری قوت کے ساتھ ان کے ملک میں گُھس آتا ہے اور اس

ناسُور کا علاج ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کے بعد کریملین اپنی کٹھ پتلی انتظامیہ کے ساتھ نام نہاد فوجی اور اقتصادی معاہدے کرتا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پر وہاں فوج اتاری جا سکے۔ یُوں ملک پر گرفت مضبوط کر کے رُوسی حُکام عوام سے کیے گئے سماجی انصاف مہیا کرنے کے خوشنما دعوے بُھلا دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ان کے گھروں کو جلایا جاتا ہے۔ ان کے بچّوں کو یتیم اور ان کی عورتوں کو بیوہ کیا جاتا ہے۔ جیلیں انسانوں سے اور زمین ظلم سے بھر جاتی ہے۔ ویت نام، کمبوڈیا، کوریا، ایتھوپیا اور افغانستان پر قبضہ اور اس کے پس منظر میں اس صورتِ حال کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

متوازی پروپیگنڈا

اپنے جرائم کی پردہ پوشی کرنے اور دُوسرے ممالک کے احتجاج اور مخالفت کو بے اثر بنانے کے لیے رُوس متوازی پروپیگنڈے کا سلسلہ شروع کرتا ہے۔ اپنے گناہ دُوسروں کے سر تھوپے جاتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ کسی اخلاق اور آئین کی پیروی نہیں کرتا۔ وسطِ ایشیا کی جس ریاست کو بھی رُوس نے ہڑپ کیا۔ وہاں پروپیگنڈے کے ذریعے جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنا ڈالا۔ افغانستان پر قبضے کے بعد بھی روسیوں کا وطیرہ یہی ہے کہ اپنی جارحیّت کا جواز فراہم کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں کہ دُوسرے ممالک مداخلت کر رہے ہیں اور رُوسی فوج عوام کی دعوت اور خواہش پر آئی ہے تاکہ ان کا تحفظ کیا جا سکے۔ بیرونی اثرات کا اثر ختم کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے کہ رُوس نے محدود تعداد میں فوج بھیجی ہے جسے بتدریج واپس بلا لیا جائے گا۔ لیکن حالات کے معمول پر آنے کے دعووں کے باوجُود فوج کو نہ تو واپس بلایا گیا نہ اس میں کمی کے آثار ہی نظر آئے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ فوج اور اسلحہ میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی طرح دُوسرے کمیونسٹ ممالک کے مسلّح گوریلے لڑنے کے لیے افغانستان لائے گئے ہیں۔ ان ملکوں میں ویتنام

اور کیوبا وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن کمالِ دیدہ دلیری سے پروپیگنڈا یہ کیا گیا کہ افغانستان میں پاکستان، ایران، امریکہ، مصر اور چین کے گوریلے لڑ رہے ہیں اور مجاہدین کو غیر ملکی وسائل میسّر ہیں۔ یہاں تک کہا گیا کہ مجاہدین کو اسرائیل ہتھیار فراہم کر رہا ہے۔

اگر افغانستان میں مداخلت سے رُوس کا کوئی اپنا فائدہ نہ ہوتا تو وہ اقوامِ متحدہ سے کہتا کہ وہ سرحدوں پر اپنی فوج متعیّن کرے تاکہ بیرونی مداخلت ختم ہو۔ اگر اسے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا ایسا ہی خیال تھا تو اس نے بین الاقوامی برادری سے مطالبہ کیا ہوتا کہ اپنی نگرانی میں غیر جانب دارانہ انتخاب کرائے۔ دُنیا کو پتہ چلتا کہ عوام کس کے ساتھ ہیں۔ اگر رُوس کی کٹھ پتلی انتظامیہ کا یہ دعویٰ درست ہوتا کہ عوام نے اس سے اپنی وفاداری کا اظہار کر دیا ہے تو ان بے گناہ بستیوں پر بمباری کرائی جا رہی ہے جہاں "وفادار بستے ہیں؟"

کمیونسٹوں کی جنّت

کمیونزم کی برکات کا اندازہ رُوس اور دُوسرے کمیونسٹ ممالک میں لگایا جا سکتا ہے جہاں انسان ایک جاندار مشین ہے، ایک ایسی مشین جس کی آنکھیں دیکھتی ہیں اور کان سُنتے ہیں، لیکن زبانوں پہ تالے ہیں۔ رُوس کی فیکٹری کے مزدور کی حالت دُنیا کے بدحال ملکوں کے مزدوروں سے بھی زیادہ خراب ہے۔ وہ صبح سے شام تک سخت محنت کرتا ہے، لیکن اس کی معاشی زندگی جوں کی توں رہتی ہے۔ وہ نہ تو اپنی مرضی سے کچھ خرید سکتا ہے نہ اپنی مرضی کی زندگی ہی گزار سکتا ہے۔ یہی وہ زندگی ہے جس کے جھوٹے سپنے کمیونسٹ دکھاتے ہیں اور دُنیا کے غریب اور فاقہ مست لوگوں کو دھوکا دے کر اپنا ہمنوا بناتے ہیں۔ اگر کمیونزم قبول کرنے سے لوگوں کو کوئی "جنّت" ملتی، تو یوگوسلاویہ، رومانیہ اور پولینڈ میں رُوس کے خلاف تحریک نہ اُبھرتی۔ خود رُوس کے

سائنسدان، دانشور اور پائلٹ آئے دن اس "جنّت" سے بھاگ کر مغربی ممالک میں نہ پہنچتے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ دنیا بھر میں مہاجرین کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے جو کمیونسٹ ملکوں سے بھاگے ہیں؟

بے ضمیر وظیفہ خوار

یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ آج اگر رُوس میں آزادانہ رائے شماری کرائی جائے، تو رُوس کی ظالم حکومت کے حق میں شاید چند ہزار سے زیادہ ووٹ نہ آئیں۔ چونکہ وہاں تمام اختیارات کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتی ہے۔ اور انتخاب بھی اپنی مرضی ہی کا کراتی ہے۔ عوام کو محض خوبصورت لفظوں سے بہلایا جا سکتا ہے۔ رُوس نے دُنیا کے کئی ملکوں میں لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے مختلف ناموں سے سوسائٹیاں اور انجمنیں قائم کر رکھی ہیں۔ جو بظاہر امن کی علمبردار ہیں۔ رُوس نے ان میں اپنے خوشامدیوں اور وظیفہ خواروں کو بھرتی کرا رکھا ہے۔ مثلاً عالمی کونسل جس کے صدر رمیش چندر ہیں۔ اسی طرح افریشیائی تنظیم برائے امن و استحکام ہے جس میں رُوس کے جی حضوری بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ بے ضمیر لوگ قتل و غارت کو انقلاب اور جبر و استبداد کو ترقّی قرار دے رہے ہیں۔

جو لوگ روس کے وظائف، انعام و اکرام اور اعزازی سندوں پر زندہ ہیں، دُنیا بھر میں رُوسی مظالم کو جواز کی سند فراہم کر رہے تھے۔ یہی لوگ آج دُنیا میں رُوس کی ترجمانی کرتے ہُوئے کہہ رہے ہیں کہ افغانستان میں ہونے والے مظالم رُوسیوں نے نہیں بلکہ مغربی ممالک نے کرائے ہیں۔ بستیاں کمیونسٹوں نے نہیں مجاہدین نے جلائی ہیں لوگوں کی املاک مغربی ممالک کے ایجنٹ لُوٹ رہے ہیں اور عوام کی عزّت و ناموس پر ڈاکے مجاہدین ڈال رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ مجاہدین نے ۱۹۷۸ء سے پہلے یہ لُوٹ مار

کیوں نہ کی۔ آخر اُس وقت بھی تو اسی ملک میں بستے تھے؟ اس وقت لوگ بستیاں کیوں نہ جلاتے تھے۔ اس وقت لاکھوں افراد ملک چھوڑ کر کیوں نہ بھاگتے تھے؟

طوطا چشمی

افغانستان میں رُوس نے اپنی طوطا چشمی اور بے مُروّتی کا ایسا نمونہ پیش کیا ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کے سوا کسی سے محبّت نہیں رکھتا۔ محبّت تو کجا، اپنے مفادات کی خاطر وہ ضرورت پڑنے پر اپنے عزیز دوستوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ترہ کی اقتدار میں آیا تو رُوسیوں کی ساری محبت اس کے ساتھ تھی۔ انہوں نے اسے "قائدِ انقلاب" اور "بابائے انقلاب" جیسے خطابوں سے نوازا، یہاں تک کہ خلق و پرچم کے باہمی نزاع کے نتیجے میں جب ترہ کی نے کارمل کو حکومت سے رُسوا کر کے نکال دیا، تو بھی رُوس نے ترہ کی سے اپنی محبّت برقرار رکھی۔ لیکن ترہ کی کو قتل کر کے امین برسرِ اقتدار آگیا تو ترہ کی کو یُوں فراموش کر دیا گیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ اس کے بعد امین کو اُمیدوں کا مرکز ٹھہرا لیا گیا۔ مگر جب امین کو قتل کر دیا گیا اور کارمل برسرِ اقتدار آگیا، تو امین کی ساری خُوبیاں ختم ہو گئیں اور کارمل انتظامیہ کی طرح روسیوں نے بھی امین کو امریکی ایجنٹ کہنا شروع کر دیا۔ کل اگر کارمل کی جگہ کوئی اور شخص برسرِ اقتدار آگیا تو کارمل کے مُبیّنہ محاسن بھی ختم ہو جائیں گے۔

عرب دوستی کا ڈھونگ

رُوس نے شرقِ اوسط کے ممالک کو ہمیشہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اسرائیل اور امریکہ کے خلاف وہ ان کا دوست ہے۔ اس سے پہلے وہ مصر کو دوستی کا فریب دے چکا ہے، لیکن اس کے فریب کا پردہ ۱۹۷۳ء میں چاک ہو گیا۔ جب

عرب اسرائیل جنگ میں مصر کا پلڑا بھاری ہو رہا تھا۔ رُوس نے مصر کو مزید اسلحہ اور فاضل پُرزے فراہم کرنے سے انکار کر کے عربوں کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا ـــــ اس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ نے اس پر دباؤ ڈالا تھا، اگر رُوس امریکی الٹی میٹم کی پروا کیے بغیر اپنی دوستی نبھانے کا فیصلہ کرتا تو اسرائیل آج عربوں کے علاقے نہ دبائے بیٹھا ہوتا، بلکہ ان کی شرائط کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوتا۔

مصر تو چوٹ کھا کر سنبھل گیا، لیکن بعض دُوسرے مسلم ممالک آشنائے حقیقت نہیں ہو سکے۔ وہ ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ رُوس شاید امریکہ اور اسرائیل کی جارحیت کے خلاف ان کا مخلص دوست ہے۔ اس سوچ کے لوگ چونکہ اسرائیل سے براہِ راست متصادم ہیں اور رُوس اپنے مفادات کی خاطر زبانی طور پر اسرائیل اور امریکہ کی مذمت کرتا رہتا ہے، اس لیے وہ انہیں مشکل میں کام آنے والا دوست سمجھتے ہیں۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ رُوس کا یہ رویّہ فلسطینیوں سے دوستی پر مبنی نہیں، بلکہ امریکہ دشمنی کا غماز ہے۔

مصر سے بے وفائی کے بعد رُوس نے شام اور لیبیا سے دوستی کے نئے پیمان باندھے ہیں۔ دونوں ملکوں کو فوجی معاہدوں کا جھانسا دیا گیا ہے، لیکن اب تک رُوس نے فلسطین کے محاذ پر کوئی ٹھوس اقدام نہیں کیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ وہ اس منطقے میں اپنے آئندہ توسیعی منصوبوں کے لیے راہ ہموار کر رہا ہے۔ دوستی کے پردے میں ایسے ایجنٹ تیار کیے جا رہے ہیں جو ضرورت پڑنے پر موجودہ حکمرانوں کی جگہ لے سکیں اس سلسلے میں رُوس کی اُمیدوں کا مرکز وہ ہزاروں عرب نوجوان ہیں جو رُوس کی فوجی اکیڈمیوں میں تربیت حاصل کر رہے ہیں۔ شام میں اخوان المسلمون کے ہزاروں رہنماؤں اور کارکنوں کو قتل کر کے وہاں افغانستان کے سے واقعات کی ریہرسل کی جا رہی ہے۔ اگر حالات جُوں کے تُوں رہے تو رُوس کو یہاں بھی مداخلت کرنے سے کوئی نہ روک

سکے گا۔

افغانستان کو کیا دیا؟

۱۹۲۱ء میں رُوس نے افغانستان سے دوستی کا پہلا معاہدہ کیا تھا۔ اس وقت سے رُوسی یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ افغانستان کی اقتصادی، زرعی اور صنعتی ترقی رُوس کی مرہونِ منت ہے۔ اگر اس دعوے میں صداقت کا ادنیٰ شائبہ بھی ہوتا تو افغانستان آج زرعی اور صنعتی لحاظ سے خود کفیل ہو چکا ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کا شمار دُنیا کے پسماندہ ترین ممالک میں ہوتا ہے۔ دوستی کے ان ساٹھ برسوں میں رُوس نے افغانستان کو کیا دیا! حقائق کا جائزہ بے حد دلچسپ ہے:

کابل کا پولی ٹیکنیک کالج، جسے "اشتراکیت کی ابتدائی نرسری" کا نام بھی دیا جاتا ہے، روس نے تعمیر کرایا۔ اس کا طریقِ تعلیم اور نصاب رُوسی ہے۔ یہاں طلبہ کو باقاعدہ اشتراکیت سے رُوشناس کیا جاتا ہے۔ کابل کو ماسکو کے قریب تر لانے کے لیے شاہراہ سالنگ کی تعمیر، کابل میں رُوسی جہاز اُتارنے کی راہ ہموار کرنے کے لیے کابل ہوائی اڈے کی تعمیر و توسیع، مکروریان رہائشی بلاک۔ ان کے علاوہ گیس کی دریافت کا سہرا بھی رُوس اپنے سر باندھتا ہے، لیکن یہ گیس رُوس ہی کے کام آتی ہے۔ وہ اسے انتہائی سستے داموں خریدتا اور مہنگے داموں یورپ کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ ننگرہار میں زرعی فارم بنایا اور نہر کھدوائی، مگر اس کی ساری پیداوار بھی رُوس بھیجی جاتی ہے۔ اس نے بعض قیمتی پتھروں اور دیگر معدنیات کا سُراغ بھی لگایا لیکن ان کو نکالنے سے گریز کیا۔ کابل میں چار صد بستر کا ہسپتال تعمیر کیا جو آج رُوسی فوجیوں کے علاج کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اسی طرح چند سڑکیں بنوائیں جنہیں آج رُوسی ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں روند رہی ہیں۔

افغانستان سے رُوس کی ساٹھ سالہ دوستی کے یہی شاہکار تحفے ہیں، ورنہ گنوانے

کو اور بھی کئی چیزیں گنوائی جاسکتی ہیں۔ وہ وطن فروش ایجنٹ بھی شمار کیے جاسکتے ہیں جنہوں نے رُوسی وظائف پر ماسکو سے ڈگریاں حاصل کیں اور پھر اپنے ملک پر رُوس کو چڑھا لائے۔ بات یہ ہے کہ رُوس نے کسی دوست ملک کو کوئی چیز بغیر قیمت کے نہیں دی، بلکہ اصل لاگت سے کئی گنا دام وصول کیے۔ یہی نہیں بلکہ سُود در سُود بھی لیا۔ اس کے بعد اسے آزادی سے بھی محروم کر دیا۔ افغانستان کو بھی رُوس کی دوستی کا یہ بھاری معاوضہ ادا کرنا پڑا ہے۔

فوجی امداد

فوجی امداد پر نگاہ ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ رُوس نے افغانستان کو چند زنگ آلود ہتھیار اور از کار رفتہ جنگی ساز و سامان کے سوا کچھ نہیں دیا۔ جدید دور میں اس اسلحہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ افغان فوجیوں کی تربیت بھی اس ڈھنگ سے کی گئی ہے کہ جدید اسلحہ کے استعمال سے انہیں آگاہی نہ ہونے پائے، تاکہ اگر کبھی ان کی صداقت کی آزمائش ہو تو وہ رُوسی امداد کے بغیر کچھ نہ کر پائیں۔ وہ فوجی افسر جو اعلیٰ تعلیم کے لیے ماسکو گئے وہ بھی کسی قسم کا تخصّص (SPECIALIZATION) کر کے نہیں آئے۔ پیشہ ورانہ تخصّص کے بجائے انہیں وہاں اشتراکیّت اور بے دینی کی تعلیم دی جاتی رہی۔

دوسرے ممالک جو رُوس کی دوستی کا مزہ چکھ چکے ہیں، یا تو اپنی آزادی کا خراج ادا کر چکے ہیں، یا اگر ابھی تک آزادی سے محروم نہیں ہوئے تو پوری طرح رُوس کے سحر میں گرفتار ہیں۔ انہیں دُنیا میں جنّت ملنے کی بشارتیں دی جا رہی ہیں۔ ان کو بڑی بڑی فیکٹریاں لگا کر بہلایا جا رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ رُوس کی مدد سے لگنے والے کارخانوں اور فیکٹریوں کا اصل فائدہ خود اس کو پہنچتا ہے۔ ذیل کے گراف میں ان ممالک کی ایک فہرست دی جا رہی ہے جو آزادی سے محروم ہو چکے ہیں یا رُوس کے سحر میں گرفتار ہیں، یا پھر رُوس کی دوستی

کا ذائقہ چکھنے کے بعد اس کے دام میں سے نکل گئے ہیں یا نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ رُوس سے دوستی یا علحدگی کا سنہ بھی ساتھ دیا گیا ہے :

ا : اسیر بلا ممالک	سال اسیری
افغانستان	۱۹۷۸ء
انگولا	۱۹۷۵ء
ایتھوپیا	۱۹۷۷ء
بلغاریہ	۱۹۴۶ء
پولینڈ	۱۹۴۷ء
جرمنی (مشرقی)	۱۹۴۸ء
چیکوسلواکیہ	۱۹۴۸ء
کمبوچیا	۱۹۷۹ء
کیوبا	۱۹۶۰ء
لاؤس	۱۹۷۵ء۔
موزمبیق	۱۹۷۷ء
ہنگری	۱۹۴۷ء
ویت نام (شمالی)	۱۹۵۴ء
ویت نام (جنوبی)	۱۹۶۹ء

ب : روس کے "دوست"	سال دوستی
بھارت	۱۹۷۱ء

شام	۱۹۷۲ء
کانگو	۱۹۶۳ء
گریناڈا	۱۹۷۹ء
گنی بساؤ	۱۹۷۴ء
لیبیا	۱۹۷۵ء
مالی	۱۹۶۸ء

ج : دوستی کے بعد دشمنی	مخالفت کا سال
انڈونیشیا	۱۹۶۶ء
سوڈان	۱۹۷۱ء
صومالیہ	۱۹۷۷ء
عراق	۱۹۷۸ء
گنی	۱۹۷۵ء
گنی (مرکزی)	۱۹۷۹ء
مصر	۱۹۷۲ء

د: رُوس کا مخالف کمیونسٹ ملک	سالِ مخالفت
چین	۱۹۶۰ء

ہ : رُوسی پالیسی کے مخالف کمیونسٹ ملک	
البانیہ	

رومانیہ
کوریا (شمالی)
یوگوسلاویہ

امریکہ

استعماری عزائم کے لحاظ سے امریکہ روس سے مماثلت رکھتا ہے، لیکن طریقِ کار میں بہت اختلاف ہے۔ اپنے روایتی حریف کی طرح امریکہ بھی پوری دُنیا کو زیرِنگیں دیکھنا چاہتا ہے۔ دُوسری جنگِ عظیم کے بعد اس نے بھی دُوسرے ممالک کو اپنا حلقہ بگوش بنانے کے لیے خاصی جدوجہد کی ہے، لیکن رُوسی کیمپ میں آنے والے جس طرح کے مصائب سے دوچار ہوئے، امریکی حلقۂ اثر کے ممالک ان سے محفوظ رہے۔ امریکہ نے اپنے حلیف ملکوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے کام بھی کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک ہاتھ سے دے کر دوسرے ہاتھ سے لینے کی پالیسی یہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ رُوس کی طرح امریکہ نے بھی ترقّی پذیر ممالک کو صنعتی ترقّی کے لیے بہت کم مدد دی ہے اس کے مقابلے میں انہیں بارُود اور مہلک ہتھیاروں سے زیادہ نوازا ہے۔ اس نے بھی اپنے حامیوں کو اپنے حریفوں کے خلاف اکسایا ہے اور انہیں ایسے حالات سے دوچار کیا ہے جس کے باعث اس کے اسلحہ کے کارخانے چلتے اور خزانے بھرتے رہیں۔

امریکہ دُنیا کے امیر ترین ممالک میں سے ایک ہے۔ دو سو برس سے یہاں ایک مستحکم جمہوری حکومت قائم ہے۔ چالیس کے قریب صدر اس پر حکومت کر چکے ہیں۔ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے ملکی مفادات کی خاطر کسی جائز و ناجائز اقدام سے اجتناب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ بعض اوقات انسانیت کے خلاف مُہلک

ترین ہتھیار بھی استعمال کر ڈالے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی نے آج بھی اہلِ جاپان کے دل زخمی ہیں۔ ویت نام میں زہریلی گیس اور نیپام بم استعمال کر کے انسانیت کشی کی روایت بھی امریکہ نے ڈالی۔

ہمدردی کی حقیقت

دنیا کے طاقت ور ملکوں کا سارا کرّوفر کمزور ملکوں کے دم سے ہے۔ عرب ممالک کا تیل نہ ہو تو امریکہ، برطانیہ، فرانس، جاپان اور مغربی جرمنی کی صنعتی ترقّی رُک جائے۔ اگر دُنیا کے ترقی پذیر ممالک انہیں خام مال فراہم کرنا بند کر دیں، تو بھی ان کے کارخانے بند ہو سکتے ہیں۔ مگر یہ جانتے ہُوئے بھی امیر مُلک اُلٹا غریب ملکوں پر احسان جتاتے ہیں۔ کیا ہمدردی اس چیز کا نام ہے کہ جس سے ایک چیز سستے داموں خریدی جائے، دُوسری شکل دے کر اسی کے ہاتھ وہ مہنگے داموں بیچ دی جائے۔ امریکہ اگرچہ دُنیا میں امن و سلامتی کا علمبردار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اور دُنیا کے غریب ملکوں سے ہمدردی جتاتا ہے، لیکن اس کا عمل اس کے دعووں سے متضاد ہے۔ رُوس کی طرح امریکہ بھی دُنیا بھر کے سائنسدانوں، انجینئروں اور دُوسرے قابل جوہر ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے ہاں لے گیا، چاہے اس کے لیے جبر کو کام میں لانا پڑا یا ترغیب و تحریص کو۔ آج بھی اگر امریکیوں کو کسی ملک کے تعلیمی اداروں میں کوئی جوہر دکھائی دیتا ہے، تو اسے خرید کر لے جانے سے دریغ نہیں کرتے۔

امریکہ اپنے آپ کو کمزور و ناتواں ملکوں کا سپاہی قرار دیتا ہے، لیکن وہ ان کی طرف ظلم کا بڑھتا ہوا ہاتھ روکنے کی اُس وقت تک کوشش نہیں کرتا جب تک اس کے اپنے مفادات پر ضرب نہ پڑتی ہو۔ اس نے اپنے پڑوسی کیوبا میں رُوس کو میزائل نصب کرنے سے روکنے کے لیے الٹی میٹم دے دیا، اس لیے کہ اس اقدام سے وہ

براہِ راست متاثر ہوتا تھا، لیکن کیوچیا پر ویت نام کی جارحیت اور ایتھوپیا اور افغانستان پر رُوسی لشکر کشی پر وہ صرف احتجاج کر کے رہ گیا۔ ۱۹۷۳ء میں عرب اسرائیل جنگ کے دوران جب اسے خطرہ محسوس ہوا کہ رُوس مداخلت کر کے اسرائیل کو نقصان پہنچا سکتا ہے، تو اس نے اپنے بحری بیڑوں کو تیار رہنے کا حکم دے دیا، لیکن جب ۱۹۷۱ء میں پاکستان کے خلاف اس کے ایک ہمسایے نے جارحیت کی، تو اُس کا ساتواں بحری بیڑہ اس وقت تک مشرقی پاکستان کے ساحل کے قریب نہ پہنچ سکا جب تک پاکستان کو دو ٹکڑوں میں نہ بانٹ دیا گیا۔

مفادات کی جنگ

پولینڈ بنیادی طور پر کیمونسٹ ملک ہے، اس میں رُوس کی مداخلت کے خلاف امریکہ اور نیٹو کے تمام ممالک نے واضح الفاظ میں اسے خبردار کیا، اس لیے کہ پولینڈ یورپ میں ہے اور امریکہ اور مغربی یورپ کے ممالک رُوس کو اپنے سر پر کھڑا ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ لیکن افغانستان جہاں رُوس نے پولینڈ سے بدرجہا زیادہ جارحیت کا ارتکاب کیا ہے، امریکہ اور رُوس کے حلیف خوبصورت الفاظ کی قرار دادیں منظور کر کے رہ گئے۔ ابتدا میں امریکی لہجے میں جو شدّت تھی اب وہ باقی نہیں رہی۔ رُوسی فوج کی آمد کے فوراً بعد اس نے رُوس پر جو اقتصادی پابندیاں عائد کی تھیں وہ بھی اُٹھالیں۔ اب یورپی ممالک کی طرف سے ایسے مضحکہ خیز بیانات آرہے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ افغانستان پر رُوس کی جارحیت کو ایک ناپسندیدہ حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان بیانات میں کہا جارہا ہے کہ رُوس کو افغانستان سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس کا مطلب یہ ہُوا کہ افغانستان پر تم نے قبضہ کر لیا، کوئی بات نہیں، مگر آگے نہ آنا، کیونکہ اس سے آگے وہ راستہ ہے جو خلیج کے تیل کے چشموں کی طرف جاتا ہے، ہم

تمہیں اس راستے کی طرف بڑھنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔

اسرائیل کا وجود اور فلسطینیوں کے حقوق کا استحصال بھی امریکہ کے شرمناک سامراجی کردار کو بے نقاب کرتا ہے۔ اسرائیل کا قیام اس لیے عمل میں آیا تھا کہ امریکہ مشرقِ وسطےٰ میں اپنا ایک مضبوط اڈّہ رکھ سکے جس کے ذریعے ارد گرد کے علاقے پہ فوجی بالادستی قائم کی جائے اور امریکی مفادات کو نقصان پہنچنے کی صورت میں ہر وقت تدارک ہو سکے۔ اسرائیل کے قیام کے تمام منصوبے امریکہ میں تیار کیے گئے اور گزشتہ تیس برس میں امریکہ کی مدد سے وہ ایک ایسے چوکیدار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے جو اپنے مالک کی شہ پہ دوسروں کے گھروں کے تالے توڑتا ہے۔

مہاجرین کی امداد

امریکہ نے افغان مہاجرین کو جو امداد دی ہے وہ بھی اُونٹ کے مُنہ میں زیرے کے مترادف ہے۔ چالیس لاکھ انسانوں کا مسئلہ صرف خورد و نوش ہی نہیں، ان کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ دُنیا کے تمام ممالک ان کی باعزّت واپسی کے لیے کوشش کرتے یا کم از کم انہیں ایک ملک پر بوجھ بنانے کے بجائے اپنے اپنے ہاں پناہ دے کر بوجھ بانٹ لیتے۔ امریکہ اگر افغانوں کا بہی خواہ ہوتا تو انہیں امریکہ میں بسنے کی پیشکش کرتا، کیونکہ اس کے وسائل اور گنجائش پاکستان اور ایران کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اگر وہ کیوبا کے پناہ گزینوں کو اپنے ہاں پناہ دے سکتا ہے تو افغانوں کو اجازت دینے میں کیا بات مانع تھی؟ گزشتہ برس امریکہ نے دو ہزار مہاجرین کو قبول کیا تو اس شرط پر کہ صرف وہ لوگ آسکیں گے جن کے دوست اور عزیز پہلے سے امریکہ میں ہوں گے یا وہ لوگ جنہوں نے امریکہ میں تعلیم حاصل کی ہوگی۔ اس کے مقابلے میں مغربی جرمنی نے بہتر سلوک کیا ہے۔ وہاں اس وقت ایک لاکھ کے قریب افغان باشندے مقیم ہیں اور حکومت ان سے اچھا سلوک کر رہی

ہے۔

رُوس کی طرح امریکہ نے بھی افغانستان کے ساتھ دوستی کے وعدے کیے تھے اور ایک زمانے میں یہاں خاصے ترقیاتی منصوبے شروع کیے جن میں سے کئی ایک پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں۔ امریکہ نے قندھار کا ہوائی اڈّہ تعمیر کیا، ہلمند کی ڈیم کی تعمیر میں مدد دی، کابل تورخم روڈ اور کابل قندھار روڈ کی تعمیر میں تعاون کیا، کابل کا حبیبیہ ہائی اسکول اور کئی اور پراجیکٹ مکمل کیے، لیکن افغانستان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے کچھ نہ کیا۔ اگر افغانستان کی معاشی ترقی کے لیے امریکہ کوئی ٹھوس قدم اُٹھاتا، تو یہ ملک اتنی آسانی سے رُوس کے چنگل میں گرفتار نہ ہوتا۔

مشروط حمایت

جس طرح امریکہ نے ایران میں اپنے حلقہ بگوش ڈکٹیٹر رضا شاہ کی حمایت کی اور فردِ واحد کی خاطر لاکھوں ایرانیوں کے حقوق کا استحصال کیا، اسی طرح افغانستان کے جہاد کے سلسلے میں بھی وہ ترجیحات کی راہ اپنائے ہوئے ہے۔ اسے مجاہدین میں ایسے لوگوں کی تلاش رہی ہے جو حالات کو اس کی آنکھ سے دیکھنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ افغانستان کے جہاد کے لیے صرف اس بنیاد پر امداد فراہم کرنا چاہتا ہے کہ مجاہدین اسے اپنا راہنما قبول کریں۔ اور اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنے کے لیے تیار ہوں۔ اگرچہ وہ رُوس اور دُنیا کے دوسرے ممالک کو یہ تاثر دے چکا ہے کہ مجاہدین اسکی حمایت اور تعاون سے جہاد کر رہے ہیں، لیکن آج تک اس نے کسی مجاہد تنظیم کو ایک کارتوس تک فراہم نہیں کیا۔

امریکہ کی پالیسی نے مجاہدین کی مختلف تنظیموں میں مزید اختلافات کے بیج بوئے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے جہاد کا آغاز کیا اور تحریکِ مزاحمت کی اصل قوت ہیں، امریکہ

کی بالادستی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں جب کہ ایک حقیر اقلیّت ایسی بھی ہے جو امریکہ کے اشارے پر ملک کو بیرونی ہاتھوں میں لے جانے کی خواہش مند ہے جنہوں نے ملک کی آزادی کا سودا چکایا تھا۔ یہ لوگ ملک میں مغربی طرز کی جمہوریت اور لبرل حکومت قائم کرنے کی باتیں کر رہے ہیں، جب کہ مجاہدینِ آزادی کی اکثریت اپنے ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی داعی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ امریکہ سے کسی قسم کی امداد لینے سے انکاری ہے۔ مجاہدین ہرگز نہیں چاہتے کہ رُوس کے جانے کے بعد امریکہ ان کی قسمت کا مالک بن جائے۔ اس لیے وہ اس کی رہنمائی قبول کرنے پر بھی کسی صُورت میں آمادہ نہیں ہوں گے۔